محمد خان اسد ... حضرو
0213
~~240~~ 213

ذاتی ڈائری

مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبیداللہ سندھی کی مختصر سوانح حیات جو انہوں نے ہندوستان
روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر مکہ معظمہ میں خود قلمبند کی۔

مولانا حسین احمد مدنی کا ایک بیان۔ جو مولانا سندھی کی سیرت پر
ایک دوست اور رفیق کی بلند پایہ تنقید ہے۔

رولٹ کمیشن کی رپورٹ کا وہ حصہ جو حضرت شیخ الہند رح کی تحریک
اور مولانا سندھی کی جدوجہد سے متعلق ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا خود نوشت
سفرنامہ کابل

ناشر

ادبستان بیرون موچی دروازہ لاہور

بار اول

اکتوبر ۱۹۴۶ء

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

کیپیٹل کو اپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپی اور ادبستان لاہور سے شائع ہوئی
محمد رفیق ملک پروپرائیٹر ادبستان

خواجہ محمد خان اسد
ٹیکس حضرو
No. ~~0210~~ 273

۵۵۷

عرضِ مرتّب

لکھتے رہے جنوں میں حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مولنا عبید اللہ سندھی کا سفر نامۂ کابل ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اور ان حالات پر مشتمل ہے۔ جو مولنا رح کو مولنا شیخ الہند رح کی جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک کابل میں پیش آئے۔ مولنا شیخ الہند رح کی جماعت کو گذشتہ جنگِ عظیم میں وہی حیثیت حاصل تھی جو موجودہ جنگِ عظیم میں آزاد ہند فوج اور آزاد ہند حکومت کو حاصل رہی ہے جس طرح موجودہ بعد از جنگ سرگرمیاں

دراصل دورانِ جنگ کی باغیانہ جد و جہد کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اِسی طرح خلافت سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۲ء کی سیاسی جد و جہد مولانا شیخ الہند رح کی جماعت اور ان کے دوسرے شرکاء کار کی سرگرمیوں کی ترقی یافتہ صورت ہی تھی۔ اگر آزاد ہند فوج یا آزاد ہند حکومت کے کارناموں کا سہرا سبھاش چندر بوس کے سر رہا ہے تو گزشتہ جنگ عظیم کی سرگرمیوں کا مرکز مولانا شیخ الہند رح تھے۔ مولانا شیخ الہند رح کی سرگرمیاں سنہ ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی تھیں۔ اور اُس اُسی پروگرام کا جزو تھیں جس کو مولانا عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں جنگِ عظیم سے پہلے بھی دو اجزاء پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند جنگِ عظیم کے دوران میں انہی سرگرمیوں کو موقع کے مناسب پھیلایا گیا۔ اور ہندوستان میں داخلی بغاوت اور اس پر خارجی حملہ کے ذریعہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کی تدبیر سوچی گئی۔ مولانا شیخ الہند رح نے دورانِ جنگ میں ان سرگرمیوں کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا۔ اور اس کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی کی [illegible] کو مناسب سمجھ کر انہیں کابل جانے کا حکم دیا۔ مولانا عبید اللہ اس سے پہلے ہندوستانی سرگرمیوں میں مولانا شیخ الہند کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ جمعیۃ الانصار کی سرگرمیوں کا انحصار انہی پر تھا۔ غالباً ایک تجربہ کار مدبر کی طرح مولانا شیخ الہند رح نے اپنی بیرونِ ہند سرگرمیوں کی تفصیلات سے مولانا سندھی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ اور مولانا سندھی وہاں کے کام تو کیا، اس کی ضرورت سے بھی قطعاً نابلد تھے۔ ان کے اس عظیم الشان اہم سفر کا حکم ان کو نہایت بے خبری میں غیر متوقع طور پر ملا۔ میرے عزیز مولوی عبد السبوح صاحب فاضل دیوبند کی روایت ہے۔ کہ مولانا سندھی رح نے خود ایک مجلس میں بتایا۔ کہ ایک دن مجھے حضرت شیخ الہند رح نے فرمایا۔ "عبید اللہ! افغانستان چلو" میں نے پوچھا "حضرت کیوں؟" اس پر حضرت شیخ الہند خاموش ہو گئے اور زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ دوسرے دن حضرت نے پھر فرمایا "عبید اللہ افغانستان چلو" میں نے پھر پوچھا "حضرت کیوں؟" اس پر خاموش تو ہوئے لیکن چہرے سے ناراضگی کے آثار نہایت ہی نمایاں تھے۔ اب میں بڑا پریشان ہوا اور دعائیں مانگنے لگا کہ حضرت ایک دفعہ پھر مجھے حکم دیں اور میں بلا چون و چرا تسلیم کر لوں۔ خوش قسمتی سے تیسرے دن حضرت نے پھر فرمایا "عبید اللہ! افغانستان چلو" میں بڑا مسرور ہوا اور تعمیل حکم کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔

حضرت شیخ الہند سے رخصت ہو کر مولانا سندھ گئے اور سفر کے لئے چند رفقاء تیار کئے۔ شیخ عبد الرحیم صاحب سندھی کی بیوی اور لڑکیوں نے اپنا تمام زیور بیچ کر ان کے لئے زادِ راہ مہیا کیا۔ کوئٹہ تک مولانا

کو پہنچا کر نقدی ان کے حوالے کی۔ اور مولنٰنا بلوچستان کے راستے افغانستان پہنچے۔ مولنٰنا نے اپنے اس سفر کے حالات بعد میں مکہ معظمہ پہنچ کر قلمبند کئے۔ یہ سفرنامہ مولنٰنا کی تشریف آوریٔ ہند سے چند سال پہلے ہندوستان پہنچا۔ اور مولنٰنا تسنیم الحق فاضل دیوبند (زیارت کاکاصاحب) کی مہربانی سے اس کا نسخہ ہمیں مل گیا جسے ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا فخر ہم اس وقت حاصل کر رہے ہیں۔

سفرنامہ کے ساتھ مقدمہ کے طور پر تین اور چیزیں شامل کی گئی ہیں۔

پہلی چیز مولنٰنا سندھی رح کی مختصر سوانح ہے جو انہوں نے ہندوستان روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے مکہ معظمہ میں قلمبند کی۔ اور ان کے ہندوستان پہنچنے پر اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد کے کچھ مختصر حالات بطور تتمہ مرتب نے بڑھائے ہیں۔

دوسری چیز مولنٰنا حسین احمد مدنی صاحب کا ایک بیان ہے۔ جو مولنٰنا سندھی کی وفات کے بعد ان کے بعض امالی سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے انہوں نے شائع فرمایا تھا۔ یہ بیان مولنٰنا سندھی کی سیرت پر ایک دوست اور رفیق کی بلند پایہ تنقید ہے۔ اور اس سے سفر کابل کے متعلق چند گوشوں کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

تیسری چیز رولٹ کمیشن کی رپورٹ کا وہ حصہ ہے جو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک اور مولنٰنا سندھی کی جدوجہد سے متعلق ہے۔ کئی مواقع پر غلط ہونے اور صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے باوجود اس بیان سے مولنٰنا سندھی کے سفر کابل کے متعلق کافی معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رح کی تحریک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس سفرنامۂ اسیر مالٹا[عہ] (حضرت مولنٰنا مدنی) اور سفرنامۂ کابل (حضرت مولنٰنا سندھیؒ) کے علاوہ اور کوئی مفصل کتاب موجود نہیں۔ مولنٰنا سندھی نے "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" میں اس موضوع پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھوانے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ مگر اس ارادہ کو عملی شکل دینے سے قبل ہی وہ واصل بحق ہوئے۔ اس میخانہ کے میکش ایک ایک کر کے اُٹھ گئے ہیں۔ صرف دو بزرگ ہستیاں مولنٰنا مدنی اور مولنٰنا عزیر گل صاحب معلومات کے لئے آخری سہارا ہیں۔ مگر

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بُلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

محمد عبدالقدوس قاسمی
زیارت کاکاصاحب ضلع پشاور

[عہ] یہ کتاب عنقریب نئی ترتیب اور دیدہ زیب شکل میں پیش ہونے والی ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

№ 0210
خواجہ محمد خان اسد
رئیس حضرو
№ 0210

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ میں مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدون شرم محسوس کئے پڑھ نہیں سکتا۔ اس لئے تصحیح کے لئے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔

کتبہ عبیداللہ سندھی دیوبند

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا تھا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا، اور بعض افراد

ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً سلمان فارسی کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا۔ تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لئے کہا تو عبیداللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی

میں بہ شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لئے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اس لئے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے

رہ گیا۔ ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے سکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری سکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے۔ جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انہیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب "لکھو کی" کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی سکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

لکھوکی

اظہار اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں

پہنچے۔ ۸ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدا کی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھر چونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابو الحسن امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبید اللہ نے اللہ کے لئے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمہ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں

تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لئے خاص دعا فرمائی "خدا کرے کہ عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے" میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سید العارفین کے خلیفہ

"بھر چونڈی" سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولوی عبد القادر صاحب سے پڑھیں (حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آ گئیں اور واپس لے جانے کے لئے بہت زور لگایا۔ مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا۔ یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خانپور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دار العلوم دیوبند

صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دار العلوم میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ

اور شرحِ جامی مولٰنا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل اُستاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھُل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لئے چند ماہ مولٰنا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولٰنا شیخ الہندؒ

دیوبند دو تین مہینے تک مولٰنا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولٰنا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولٰنا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اوّل نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا"۔

چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کئے جن میں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں بلکہ

راسخین فی العلم وہبی علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولٰنا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لئے حضرت مولٰنا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا +

جہان آباد دہلی

بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں۔ اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کر لی۔

مولوی صاحب حضرت مولٰنا قاسم اور حضرت مولٰنا رشید احمدؒ کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولٰنا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سنے +

حالاتِ سندھ

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا (اس تمام سفر میں ایا یا وہاں لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا) میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد

پڑھی ۔

سید العارفین کے دوسرے خلیفہ

شوال ۱۳۰۸ھ سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابو الحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا ۔ انہوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا ۔ میرے لئے بمنزلہ باپ کے تھے میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا میری والدہ کو بلایا ۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں ۔ میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا ۔ میں اِن کے ظلِ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا ۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم

گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا ۔ میں دورانِ مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا ۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت

اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا ۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں ۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انہیں سے سیکھا وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے ۔

حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں ۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے ۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلہ علما میرا رہبر بنا اور ان کو میں نے اپنا امام بنا دیا ۔

مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ اِس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہو گئیں ۔ اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا ۔

میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا ۔ اس کے معارف میری روح سے پیوست ہو گئے ۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا تھا ۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا ۔ میں نے علماء کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہند رح سے پڑھی ۔

طریقہ قادریہ

اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے

خلیفۂ اعظم مولانا ابوالسراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی ✤

ص ۲۶۵

میرا سیاسی میلان

دورانِ مطالعہ میں مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتداء سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوط دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کی تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا ✤

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ ہے ✤

ص ۲۶۱

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آ کر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس لئے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا۔ کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان کے لئے تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالکؒ کو بھی خواب میں دیکھا ✤

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام

کرنے کیلئے حکم دیا اور فرمایا کہ اسکے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہیگا۔ چار سال تک جمعیتہ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیتہ کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے ◆

۵۶۱ص

نظارۃ المعارف دہلی

۵۶۳ص

حضرت شیخ الہند رح[1] کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ سنہ۱۳۲۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لے

---

[1] حضرت یوسفؑ کی اقتدا میں مولانا سندھی نے ان تلخ واقعات کا تذکرہ یہاں نہیں فرمایا جو ان کے دیوبند چھوڑنے کا باعث بنے۔ رولٹ کمیشن کی رپورٹ میں ان کی طرف اشارہ موجود ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ کے ارباب اہتمام نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے ان کے چند مسائل کو بہانہ بنا کر ان پر کفر کا فتوے لگا دیا اور انہیں مدرسہ سے الگ کیا جس کے بعد مولانا دہلی چلے گئے اور وہیں مرکز قائم کر کے مولانا شیخ الہند رح کی ہدایات کے مطابق کام کرتے رہے۔ انہی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا انور شاہ رح نے دیوبند سے مولانا سندھیؒ کے نام مکہ معظمہ پیغام بھیجا تھا۔ کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ کے لئے کوئی رنج نہیں امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے ◆

آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلےٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا ◆

ہجرت کابل

سنہ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم[1] سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رح قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے طیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادمِ شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

میں سات سال تک حکومتِ کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ سنہ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی۔ کہ میں انڈین نیشنل کانگریس

---

[1] اس حکم کی نوعیت کے لئے شروع میں عرض مرتب کو دیکھ لیجئے!

میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں مَیں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے۔ اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

۵۶۳

سیاحت روس

۱۹۲۳ء میں ترکی جاتا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا۔ کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا) +

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا ہوں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقاء جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی سوشلسٹ بھی، اور نیشنلسٹ بھی سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکرگزار رہونگا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللہ الحمد وحدہٗ۔

جدید ترکیا

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا میرے لئے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارتِ خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ معین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ و فرانس اس پر قابض تھے) تخمیناً تین سال ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحادِ اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا۔ مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لئے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی، مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے +

ہمارا پروگرام

یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے۔ کہ میں اپنے استاذالاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک

اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا۔ اجازت نہیں دی بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ افکار ہوا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے تھے۔ نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے وہ میرے لئے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اب میں نہایت گاندھی کا ممنون ہوں میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا لیکن اس بنا پر پریٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلادی میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومنین حیث وجدھا فھو احق بھا۔

ص ۵۶۵

مکہ معظمہ

سنہ ۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ معظمہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آرہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر سنہ ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا

تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہو گیا۔ اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے۔ اس لئے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاھم اللہ خیرا۔

علماء مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب (دہلی) مرحوم تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں یقیناً ۱۲-۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لئے مشکل تھے۔ اس زمانہ میں انہیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حاصل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعوے میں نہیں کر سکتا۔

لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک

عملی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔

میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ خیر کثیر۔ تفہیمات الٰہیہ سطعات۔ الطاف القدس لمعات وغیرہ۔

ان کی کتابوں کے لئے بطور مفتاح میں نے مولنا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولنا اسماعیل شہیدؒ کی طبقات اور مولنا محمد قاسمؒ کی قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔

مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدارسۂ قرآن حکیم بھی جاری رہی۔ اس سے میری نظریات بہت وسیع ہوگئیں۔ للہ الحمد۔

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ

اگر مجھے موقعہ دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کرلوں۔ اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولنا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کے منتسب اور مولنا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولنا محمد قاسمؒ کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کرلوں۔ تو میں اس حکمت کا ایسا سکول قائم کرسکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم (ب) سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وسنت الخلفاء الراشدین (ج) تاریخ اسلام

کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہوجائے ذلك من فضل الله والله ذو الفضل العظيم

مراجعت وطن

۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔ اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم سر پر آگیا۔ اس لئے ادائے مناسک کے بعد سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے (واللہ الموفق)

ہندوستان میں پروگرام

ہندوستان پہنچ کر میرا پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہوں گا تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے۔ اور میں پریشان دوستوں کے مشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں لیکن کانگریس کی کسی پارٹی کے عملی حصہ میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم واشاعت ہوگا۔ میں

اعلا طبقۂ اہل علم کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانشمند دونوں مخاطب ہوں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم ہندو مسیحی آزاد منش اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری امداد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفۂ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کرونگا۔

(واللہ المستعان واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین)

جبال الصولتیہ
بلد اللہ الحرام

عبیداللہ

تتمہ

مولٰنا سندھی کی مندرجہ بالا سوانح ان کی اپنی تحریر کردہ ہے جو ہندوستان روانہ ہونے سے پیشتر مکہ معظمہ میں معرضِ تحریر میں آئی بعد کے واقعات کا اجمال یہ ہے ۔

ہندوستان آنے کی تمنا کیوں تھی

اگرچہ مولانا کا ارادہ ۱۹۳۸ء میں ہی ہندوستان آنے کا ہو گیا تھا ۔ مگر نامعلوم واقعات کی بنا پر ان کا آنا ایک سال کیلئے معطل ہوا ۔ اور وہ ۱۹۳۹ء میں سرزمین عرب سے روانہ ہو سکے ۔ مولٰنا نے ایک خاص مقصد (احیائے اسلام) کیلئے اپنی زندگی وقف سمجھی تھی ۔ اور زندگی کے ہر مرحلے پر ان کے مطالعہ اور ان کے تصورات کا محور اسی مقصد کا حصول تھا ۔ طویل اسفار و گرد و پیش کے افکار کا مطالعہ و تنقید اور وسیع عرصہ کے غور و فکر کے بعد بلد اللہ الحرام میں انہوں نے اپنے طور پر ایک نظام کا تعین کر لیا تھا ۔ اور ہندوستان کی تمنائیں صرف اس لئے تھیں کہ یہاں ان کو اپنے افکار کے پھیلانے اور ایک صالح جماعت کے تیار کرنے کا موقع مل جائیگا ۔ چنانچہ پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب آپ ہندوستان آنے کیلئے مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تو آپ کی عجیب حالت تھی ۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مولانا پر اس وقت غیر معمولی تاثر کی کیفیت طاری تھی ۔ جوار حرم میں رہتے ہوئے بارہ سال ہو گئے تھے ۔ ایک طرف ان

کو چھوڑنے کا قلق تھا۔ اور پھر وطن کی مراجعت جذبات میں تلاطم پیدا کر رہی تھی ایک ہندوستانی بزرگ جو خود بہت بڑے عالم ہیں۔ اور ان کا خاندان مستقل طور پر حجاز میں بس گیا ہے اور انکے کاروبار کا وسیع سلسلہ ہے۔ بارہ سال کے عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ہو گا کہ مولانا کی صاحب موصوف سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ آپ مولانا کے ساتھی بھی تھے اور ایک لحاظ سے شاگرد بھی۔ انکا اصرار تھا کہ مولانا بیت الحرام میں رہیں لیکن مولانا سمجھتے تھے کہ انکا وطن واپس جانا ضروری اور مفید ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات بڑی رقت انگیز تھی۔ رخصت ہوتے وقت مولانا نے ان سے فرمایا کہ میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بیشک اسلام پوری قوت اور توانائی کیساتھ ایک بار پھر ابھریگا لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں ہو گا جو اس وقت ہے۔ مجھے جسطرح اس بات پر یقین ہے کہ اسلام ایکبار پھر ابھریگا۔ اسی طرح میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ہمارا موجودہ ڈھانچہ اب چند دنوں کی چیز ہے۔ اسلام کو اپنا ایک نیا ڈھانچہ بنانا ہو گا اور مسلمان اسے جسقدر بھی جلد بنالیں بہتر ہو گا۔ یہ وہ عقیدے ہیں جو مجھے کشاں کشاں ہندستان لیے جا رہے ہیں۔ میں اب چراغ سحری ہوں خدا معلوم زندگی کے چند دن اور ہونگے۔ چاہتا ہوں۔ مرنے سے پہلے اپنی قوم کے کانوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں۔[ل]

ہندوستان میں آمد اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات

الغرض یہ تمنائیں لے کر وہ مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کے ساحل پر اترے۔ کراچی، لاہور، دیوبند اور دہلی میں انکا شاندار استقبال کیا گیا۔ قوم کو ان سے اور ان کو قوم سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ مولانا کے

[ل] مولانا عبید اللہ از پروفیسر محمد سرور ص ۱۷۸۔

عقیدت مندوں میں وہ لوگ بھی تھے جو مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحمید صاحب کے واسطہ سے ان کے تفسیر قرآن سے متاثر ہوئے تھے اور وہ بھی تھے جن کو ان کے سیاسی رجحانات اور ماضی کے رجحانات کی وجہ سے ان سے عقیدت تھی چنانچہ مولانا کی آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبہ ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے۔ مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعہ اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن و فکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی تھی اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار و خیالات کا اظہار کرنے لگے عقیدتمندوں کا یہ جمگھٹا چھٹتا گیا۔ اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیتہ العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیتہ العلمائے صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی۔ اور عام شاہراہوں سے الگ ہو گئے۔ مولانا جوشیلے مجسمہ انقلاب تو تھے ہی۔ "چراغ سحری" ہونے کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا کر دی تھی۔ اور ہر اس نظام کو فوراً توڑنے کے حق میں تھے۔ جو ان کے خیال اور ان کے مطالعہ کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لئے مفید نہ تھا۔ وہ کانگریس کی "مذہبی" قیادت اور دیگر اسلامی

جماعتوں کی "قدامت پسندی" سے نالاں تو تھے ہی۔ خاکسار تنظیم کی حمایت سر سکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشتراکی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دین الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو ان سے توڑ دیا اور مولنا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولنا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابل قبول ہیں جب اصول دین سے ان کی مطابقت مسلّم ہو جائے۔

مولنا کا مخصوص پروگرام، اور اس کی تکمیل، جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی

سرزمین حجاز کو چھوڑنے سے پیشتر ہی مولنا نے ہندوستانی پروگرام کے تین حصے کر لئے تھے کانگریس کی ممبری، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تلقین اور کانگریس میں اپنی پارٹی کا قیام۔ ہندوستان پہنچنے پر مولنا نے اپنے پروگرام کے تیسرے جزو کو جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے نام سے روشناس کیا۔ اس پارٹی کا نصب العین ان کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے آخری ورق پر مندرج ہے۔ اور لاہور و سندھ میں اس کی شاخیں بھی موجود ہیں۔ مگر سیاسی پارٹیوں کے قیام کے لئے جس گرم جوشی اور سرگرم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مولنا کی زندگی میں مولنا کو نہ مل سکی۔ اور اس پارٹی کا وجود صرف نظریے تک ہی محدود رہا۔

◆

شرکت کانگریس

پروگرام کے پہلے جزو (کانگریس کی ممبری) کے متعلق مولنا ہر مجلس میں فرماتے رہے کہ مجھے نیشنل کانگرس سے محبت ہے۔ کیونکہ دنیا کی نظر میں وہ ہمارے ملک کی معزز سیاسی مجلس ہے میں سولہ سترہ برس کانگریس میں کام کرتا رہا ہوں۔ مولنا نے ہر خطبہ اور ہر مجلس میں اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ہندوستان کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ سیاسی جدوجہد اور کانگریس کو صحیح نمائندہ جماعت بنانے میں ہے۔ ایک واحد سیاسی جماعت کی ضرورت اس لئے انہوں نے محسوس کی، کہ کل ہندوستان کی سیاست اور معیشت کا نظام ایک ہی طرز پر قائم ہو۔ ان کے خیال میں یک جہتی اور امن قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں کل ہندوستان کی نمائندگی کے لئے ایک جماعت کا ہونا ضروری تھا۔ بصورت دیگر ہندوستان کے لئے دوسری قوموں کے سامنے ذلت و رسوائی کے علاوہ دوبارہ غلامی کا خطرہ ہے۔ یہ واحد جماعت ان کے خیال میں کانگرس ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے مولنا کانگرسی تھے اور کانگریس میں رہنا چاہتے تھے مگر ان کو کانگریس کی موجودہ نیم مذہبی و نیم سیاسی قیادت سے شکایت تھی اور وہ اسے مسلمانوں کے قومی وجود کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس نظام کے تصور میں شریک ہونے کے باوجود اس میں منسلک نہ ہو سکے اور ہندوستان کے ان آخری

چند سالہ قیام میں کبھی کانگریس کے پرائمری ممبر بھی نہ بنے +

بیت الحکمتہ اور ولی اللہی فلسفہ کی تلقین

شاہ ولی اللہ فلسفہ کو سمجھانے اور پھیلانے کے لئے مولٰنا نے دہلی اور لاہور میں مرکز کھولے اور نہایت سرگرمی سے ان نوجوانوں کی تربیت کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ جو عقیدت مندوں کے جمِ غفیر کے الگ ہو جانے کے بعد ان سے وابستگی میں ثابت قدم رہے۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے پیر جھنڈا، کراچی، لاہور اور دین پور میں بیت الحکمتہ کھولے۔ اور ان طلبائے کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ جو ان کے خیالات کو سننے اور ان سے استفادہ کرنے کیلئے آمادہ تھے اس مقصد کے لئے ان کی جدوجہد اور دلی جذبات کا اندازہ کرنے کے لئے ہم ایک واقعہ کا ذکر بطور نمونہ کرتے ہیں۔ دہلی میں مولٰنا ادریس میرٹھی کے مکان پر ہر جمعہ کے دن مقامی فضلأ دیوبند کا اجتماع اور مذاکرۂ علمی ہوتا تھا۔ مولٰنا بھی ان دنوں اوکھلا (جامعہ نگر) میں مقیم تھے۔ جو جامع مسجد سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس اجتماع میں شرکت کے لئے مولٰنا بالالتزام جمعہ کی نماز سے پہلے جامع مسجد تشریف لاتے اور عصر کے بعد واپس جاتے۔ ظہر اور عصر کے درمیان مذاکرہ ہوتا۔ مولٰنا حجتہ اللہ البالغہ کے جستہ جستہ مقامات کا درس دیتے اور شکوک و شبہات نہایت اطمینان سے حل کراتے۔ اس التزام کو نباہنے کے لئے دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مولٰنا کے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے۔ انہوں نے یہ طویل مسافت اس بڑھاپے کے عالم میں پیدل طے کی اور اجتماع میں شریک ہوئے ہیں۔ مگر چہرے کی بشاشت میں فرق نہیں آنے دیا ہے +

مولٰنا اور مدرسۂ دیوبند

شاید فضلائے دیوبند کے اس اجتماع کی شرکت کا التزام اس لئے بھی ہو کہ مولٰنا کو مدرسۂ دیوبند کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی۔ اور وہ یہاں کے فضلاء میں افکارِ عالیہ کی ایک روح پھونکنا چاہتے تھے۔ مولٰنا نے اپنی زندگی کا عملی پروگرام جمعیتہ الانصار سے شروع کیا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کے ہر قدم پر اس جماعت (دیوبند اور اس کے متعلقین) کے لئے سوچتے رہے۔ مولٰنا کو اپنی واپسی پر یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ کہ وہ دیوبند جو کبھی فقہ (مولٰنا رشید احمدؒ) و حکمت (مولٰنا شیخ الہندؒ) کا میدان تھا۔ اپنے مقام سے پیچھے ہٹ کر جمود و رجعت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس جمود و رجعت کو ہٹانے کے لئے وہ

لہ سخت کوشی مولٰنا کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں مولٰنا کا جامعہ نگر میں قیام تھا۔ دہلی میں اس دفعہ سخت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بعض دفعہ صبح کو اتنی کہر چھائی ہوتی کہ دن کے دس گیارہ بجے تک دھوپ دیکھنے میں نہ آتی۔ مولٰنا حسبِ معمول بہت سویرے اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ جامعہ نگر سے تین چار فرلانگ پر دریائے جمنا ہے۔ جہاں سے ایک نہر نکلتی ہے۔ موصوف نہر پر یخ پانی سے وضو کرتے، نماز پڑھتے اور وہیں چہل قدمی کرتے کرتے ذکر و اذکار سے فارغ ہوتے۔ صبح کے ان معمولات سے جب مولٰنا فارغ ہوتے ہیں۔ تو ان کی طبیعت میں بڑی تازگی اور انبساط ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ طلبا موجود ہوں تاکہ آپ درس دیں +

(مولٰنا عبیداللہ سندھی ص ۱۰۴)

چلائے۔ چیخے اور جھنجلائے اور آخرکار صرف اتنی بات پر شکر گزار رہے کہ مدرسہ کے تکمیلی نصاب میں حجۃ اللہ البالغہ اور مولنا محمد قاسم رح کی کتابوں کو جگہ مل گئی۔ مولنا عبید اللہ کے فلسفہ کی تفصیلات سے ہمیں بھی اختلاف ہے۔ مگر علم و حکمت کی طرف دعوت میں وہ حق بجانب تھے۔ اور مدرسۂ دیوبند کے لئے ان کی اس دعوت کو زیادہ زور کے ساتھ اہتمام دینا مناسب تھا +

وفات

ہندوستان میں مولنا کے پانچ آخری سال اس جدوجہد اور کشمکش میں گزرے آخرکار اجتماعِ فکر و عمل کی اس عجوبۂ روزگار ہستی نے ۲۱ر اگست ۱۹۴۴ء کو بمقام دین پور ریاست بہاولپور اس کارگاہِ عنصری کو الوداع کہی اور سفر گزیں مقامِ علیین ہو کر قرینِ ابد ہوئے۔ اللہ تعالےٰ انہیں فردوسِ بریں میں اپنے الطافِ مخصوصہ کی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین +

تصانیف

مولنا کے ابتدائی زمانے کے رسالے اور تصانیف اب ناپید ہیں۔ ہندوستان کے اس آخری قیام میں انہوں نے ”شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک“ اور ”شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ“ دو کتابیں لکھ کر شائع کیں ایک اور کتاب گویا ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ایک اور اہم کتاب کتاب التمہید عربی ابھی قلمی ہے اس کے علاوہ انکے خطبات چھپے ہیں اور ان کے افکار پر ایک بسیط کتاب ”مولنا عبید اللہ سندھی“ کے نام سے پروفیسر محمد سرور صاحب نے لکھی ہے جو ان کے خیالات کو ایک مرتب شکل میں دکھانے کے لئے نہایت کامیاب کوشش ہے +

تعارف

از

مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے متعلق مختلف قسم کے مضامین پریس میں شائع ہوئے ہیں جس کی بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت الامر کو شائع کر دیا جائے۔ تاکہ ناظرین اعتدال کی راہ اختیار فرماتے ہوئے افراط و تفریط سے بچ جائیں اور جن باتوں کو مذکورۂ ذیل معروضات کے خلاف دیکھیں اس کی حقیقت سمجھیں، نیز ناظرین سے پر زور اپیل ہے کہ مولانا مرحوم کے اصل جذبات اور نصب العین کی قدر کرتے ہوئے، جوان کی عمر کا بہترین سرمایہ تھا اور تادم مرگ ان کو ملک بہ ملک پھراتا رہا تھا۔ رائے قائم فرمائیں۔

مولانا عبید اللہ مرحوم ذکی الطبع اور سمجھ بوجھ والے جفاکش اور محنتی ابتدائے عمر سے واقع ہوئے تھے عنفوان شباب کی غلط کاریوں اور لغو بے معنی حرکات جو کہ اس زمانہ میں نوجوانوں میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ مرحوم میں ان کا

موجود نہ تھا۔ ان کا تمام زمانۂ طالب علمی استقامت اور اعتدال سے مزین رہا کتب بینی اور مشاغل علمی میں انہماک رکھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ان کی ذکاوت علمی دلچسپی اور استقامت ہی کی بنا پر ان سے زیادہ مانوس رہتے تھے۔ ابتداء ہی سے ان کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے علماء رحمہم اللہ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔ مرحوم ان کی کتابوں اور رسائل کو بغور اور جدوجہد کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے تھے تا اینکہ اکثر مضامین ان کتب کے ان کو ازبر ہو گئے تھے۔

دار العلوم دیوبند میں کتابیں ختم کرنے کے بعد ان کا سندھ کے علمی مراکز میں قیام رہا اور اس زمانہ کے وہاں کے اکابر سے تعلق شدید رہا۔ انہوں نے علم ظاہر کے مشاغل کے ساتھ تصوف کے مراحل میں بھی مدتوں دوڑ دھوپ اور تگ و دو جاری رکھی جن کا اثر ان پر نمایاں ظاہر ہوتا تھا

جن لوگوں نے ان کو ۱۳۲۶ھ اور اس کے مابعد کے زمانہ میں دیکھا ہے وہ خوب ہی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً نہایت ساکت و صامت رہتے تھے فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز اور مشاغل قلبیہ اور معارف الٰہیہ میں منہمک، عبادات اور اعمال صالحہ کے دلدادہ، بزرگان دین اور اکابر سلف کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متادب پائے جاتے

تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت اور رزانت ٹپکتی تھی۔ قرآن شریف کی خدمت اور احادیث نبویہ اور کتب دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایہ حیات تھا۔ ان پر زر و مال، جاہ اور عزت کا کوئی اثر نہ تھا۔ روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جاہِ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشیٔ محض خیال کرتے تھے۔ امراء اور اہلِ دولت سے ان کو وابستگی تو درکنار نفرتِ تامہ تھی۔ غرباء اور فقراء طلبہ اور اہل اللہ سے ان کو انس عظیم تھا۔

دن رات اسی اصلاح عقائد و اعمال کی ترقی کی فکر اور امتِ مسلمہ کی مغربی زہرآلودہ تعلیم اور الحاد و بے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت مشغلہ اور نصب العین تھا۔ اسی نصب العین کے ماتحت دار العلوم کی ترقی کے لئے وہ سندھ سے دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے انہوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی اور اسی کے لئے انہوں نے دہلی میں مدرسہ معارف القرآن کی بنا ڈالی اس زمانہ میں ان کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا اسی نصب العین کے زیر سایہ رہتا تھا مگر کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جنگ طرابلس اور بلقان کے روح فرسا اور اطمینان کش واقعات پیش آئے۔ جنہوں نے سابقہ جنگ روم اور روس اور جنگِ یونان وغیرہ پر یورپین اقوام کے غیر منصفانہ اور وحشیانہ بے راہیوں سے پیدا ہونے والے اور غیر مندمل زخموں میں نہایت زیادہ نمک پاشی کی۔ اور حساس

مسلمانوں اور بالخصوص حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے غیرت مند دل میں انتہائی قلق اور بے چینی پیدا کر دی ۔

حضرت رحمۃ اللہ اور دیگر باغیرت مسلمانوں نے اسی تاثر قوی کے ماتحت ہلال احمر کے لئے چندہ کی تحریک کی جس پر مسلمانانِ ہند نے عموماً لبیک کہا ۔ مگر اس پر باخبر حلقوں اور سمجھدار طبقوں میں اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور نہ قلق و اضطراب میں کوئی کمی ہوئی ۔ ادھر مضامین الہلال نے جو اس زمانہ میں نہایت پُر زور اور پُر اثر تحریر کے ساتھ شائع ہوتے تھے یقین دلا دیا کہ برطانوی سامراج نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے بلکہ اس کو عالمِ وجود سے بھی مٹا دینا چاہتا ہے ۔ اس لئے بجز آزادی ہندوستان کوئی صورت ممالک اسلامیہ کی امداد اور خود مسلمانانِ ہند بلکہ تمام اہلِ ہند کی مشکلات کے حل ہونے کی نہیں ہو سکتی ۔ انہی جذبات اور تاثرات نے جن میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سرشار ہو رہے تھے ۔ ان کے باغیرت اور باہمت دل میں بے چینی اور اضطراب کی موجیں مارنے والی لہریں پیدا کر دیں اور مجبور کر دیا ۔ کہ خود بھی سربکف ہو کر آزادی کے میدان میں کودیں اور دوسروں کو بھی کودائیں ۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو بیدار کرتے ہوئے اس قدر متاثر کیا ۔ کہ مولانا عبیداللہ صاحب اپنے سابق نصب العین سے تقریباً ہٹ گئے ۔ اور آزادی ممالک اسلامیہ بالخصوص آزادی ہند ان کا نصب العین ہو گیا جس

کے نتیجہ میں اب ان کی زندگی اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، سوچ بچار صرف آزادی ہندوستان اور آزادی ممالک اسلامیہ ہو گئی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جنگِ عظیم کی گھنگھور گھٹاؤں نے دنیا کو گھیر لیا ۔

یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس قسم کے قلوب ماہی بے آب کی طرح تڑپ میں نہ آئیں چنانچہ اپنی اپنی بساط کے موافق تگ و دو کرنے لگے ۔ بالآخر اسی تاثر میں مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کابل اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے ۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ جذبہ آزادی روز افزوں ترقی کرتا رہا اور اس قدر اس میں غلو ہو گیا کہ اگر اس کو جنون کا درجہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ افکار تھے تو اس کے، زبان پر ذکر تھا تو اس کا، تدبیریں تھیں تو دن رات اسی کی، اعمال تھے تو اسی کے ۔

کابل میں پہنچنے کے بعد مرحوم نے امیر حبیب اللہ خاں صاحب مرحوم اور ان کے حاشیہ نشینوں سے اس مقصد کے ماتحت تعلقات قائم کر کے اپنی امیدوں کی شمع کو روشن کیا ۔ مگر امیر حبیب اللہ مرحوم کی شہادت نے ان کی تمام شمعوں کو بجھا دیا ۔ اور ان کی حسرت و یاس کی کوئی حد باقی نہ رہی ۔ تاہم چونکہ فطرت نے ان کو لوہے کا قلب اور نہ تھکنے والا دماغ دیا ہے ۔ وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہے اور یہ شدید مایوسی بھی ان کے اعضاء کو بے کار نہ کر سکی ۔ جب امیر امان اللہ سریر آرائے سلطنت ہو گئے ۔ تو موصوف نے اپنی جدوجہد کا

مرکز ان کی ذات ستودہ صفات کو قرار دیا۔ افغانستان کی جنگ آزادی میں مرحوم کی سکیموں اور کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا۔ چنانچہ ایک مشہور جنگی انگریز افسر کا قول ہے کہ یہ کامیابی افغانستان کی نہیں ہے بلکہ عبید اللہ کی فتح ہے۔

یقیناً جو سکیم جنگ کی تیار کی گئی تھی۔ وہ اگر بروئے کار آجاتی اور خیانتیں نہ ہوتیں تو عظیم الشان کامیابی ہو جاتی مگر مشرقی کمان کی خیانت نے تمام کی کرائی محنت تقریباً برباد کر دی۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کر لی گئی۔

دوسرا سخت صدمہ تھا جو کہ مولانا عبید اللہ صاحب کے بے چین اور مضطرب قلب کو مشرقی کمان کی شکست اور خیانت سے لگا۔ مولٰنا عبید اللہ صاحب کی سرگرمیاں اور ان کی ذہنی رسائی اور اعلٰے درجہ کی سکیمیں ایسی نہ تھیں کہ وہ برطانوی لوگوں کو ان کی طرف سے مطمئن رکھتیں۔ بالآخر ان کو کابل بلکہ افغانستان سے نکل جانا پڑا۔ حالانکہ افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کی جا چکی تھی۔ یہ پہلا دھکا تھا جس کا سخت صدمہ ان کے قلب اور دماغ کو اٹھانا پڑا۔

جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی حکومت کو شکست اور عراق۔ شام فلسطین حجاز یمن اور نجد وغیرہ کا خلافتِ اسلامیہ سے جدا ہو جانا اور صلیبی اقتدار کے ماتحت آجانا کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس نے ہر مسلمان کے قلب پر نہایت زہریلے سانپ لوٹائے۔ بالخصوص اصحاب حمیت اور باغیرت مسلمانوں کو تو انتہائی تکلیف پیش آئی۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کے قلب اور قلب و دماغ پر اس کا جو کچھ اثر ہوا وہ سوائے خداوند کریم کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ وہ چوتھا عظیم صدمہ تھا جس کو ان کے قلب اور دماغ کو برداشت کرنا پڑا۔

مولٰنا مرحوم افغانستان سے جدا ہو کر روسی ممالک میں پھرتے ہوئے بخارا، ماسکو، اٹلی، استنبول وغیرہ پہنچے، اور سالہا سال ان سخت سرد اور اجنبی ملکوں میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ اعزا و اقربا ساتھ نہ تھے یار اور احباب ہمدردی کرنے والے موجود نہ تھے۔ مال و متاع جس سے غربت اور مسافرت کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں موجود نہ تھا۔ نیز خبر گیری اور امداد کی جھلک بھی نہ تھی۔ استاد مرحوم (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) جن کا سہارا ظاہری شمار کیا جا سکتا تھا۔ مالٹا میں قید تھے، پے درپے مہینوں فاقے کرنے پڑے میل ہا میل پیدل چلنا پڑا۔ برف کے ڈھکے ہوئے ملکوں میں جاڑے کی سخت تکالیف جھیلنی پڑیں۔ تنہائی اور کس مپرسی کا عذاب برداشت کرنا پڑا غیر مسلم، ناواقف، زبان نہ جاننے والے اجانب میں بسر کرنا پڑا۔ ان عظیم الشان صدمات اور جانگداز احوال میں مولانا کا زندہ واپس آجانا قدرت کے اعجوبات میں سے نہیں تو کیا ہے۔

وطن اور مذہب کی آزادی کے لئے اور بھی متعدد اشخاص نے مشکلات

اور مصائب جھیلی ہیں۔ مگر مولانا عبید اللہ مرحوم کی سی مشکلات کس نے جھیلیں۔ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ اور ذرے کا فرق پایا جائے گا۔ ان مصائب عظیم غیر متناہیہ نے اگرچہ مولانا مرحوم کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے میں شکست کھائی اور مولانا کی سخت جانی ہی غالب رہی۔ تاہم وہ مولانا کے دماغ اور قلب کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ مولانا دماغی توازن کھو بیٹھے، صبر و تحمل، حلم و بردباری، استقلال اور گراں باری وغیرہ نے جواب دے دیا۔ فکر، غور اور جرأتِ طبع جو کہ مولانا مرحوم کو مضامینِ عالیہ اور سیاسیات مدینہ کی عمیق سے عمیق گہرائیوں تک پہنچانے والے تھے۔ وہ تقریباً کافور ہوگئے۔

مولانا مصائب جھیلتے ہوئے جب حجاز پہنچے اور ہم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے تو ان کی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب اور تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے دیکھا کہ مولانا کی وہ متانت اور رزانت، حلم و بردباری، وہ سکون و سکوت جن کو ہم پہلے مشاہدہ کرتے تھے۔ سب کے سب تقریباً رخصت ہو چکے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ غصہ آجاتا ہے باتیں بہت زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی مجلس میں متضاد امور صادر ہوتے ہیں۔

ہندوستان تشریف لانے کے بعد بھی ان متضاد امور میں کمی نہیں ہوئی بلکہ کچھ اضافہ ہی رہا جس کی بنا پر ہم کو یقین ہو گیا کہ مولانا کے دماغی توازن پر

کاری اثر پڑا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جو ناساز احوال اور گوناگوں صدمات عظیمہ ان کو پیش آئے تھے ان کا یہ اثر بہت ہی کمترین اثر تھا۔ چنانچہ متعدد مجالس میں خود مولانا بھی اس کے مقر ہوئے۔ ایسے احوال میں یقیناً ہر چیز کا جادۂ اعتدال و استقامت سے ہٹ جانا اور جملہ شئون میں اختلال پیدا ہو جانا طبعی بات ہے۔

چنانچہ یہ دماغی اختلال نہ صرف مولانا کی سیاسیات ہی تک محدود رہا بلکہ علمی اور مذہبی تقاریر اور تحریرات تک بھی متجاوز ہوا۔ اور اسی امر نے مولانا کی اعلیٰ قابلیت اور بیش از بیش قربانیوں کے ہوتے ہوئے ہندوستانی پبلک اور سیاسی رہنماؤں میں اس پوزیشن اور رتبہ کو مولانا مرحوم کے لئے حاصل نہ ہونے دیا جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔ مولانا کا کلام ان کی شدت ذکاوت اور مہارتِ علمی کی بنا پر پہلے بھی بہت زیادہ دقیق ہوتا تھا جس کو سمجھنے کے لئے اہلِ علم و فہم کو بھی غیر معمولی غور و فکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے قابل اور غیر معمولی نتائج اس آخری دور میں بھی جبکہ وہ مصائب کی بوقلمونیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ برس ہا برس کی جد و جہد اور اعلیٰ استعداد کی بنا پر ایسے سیاسی اور نظری حقائق بھی ظہور پذیر ہوتے رہے۔ جو اہلِ فکر کے لئے دعوت فکر و نظر کا سامان تھے۔ ان سے اصحاب فہم حضرات اصولی طور پر رکھ کر صحیح نتائج کا استخراج کر سکتے ہیں۔ مگر اب اس حادثہ کی بنا پر اور بھی زیادہ الجھنیں پیدا ہونے لگیں۔ چنانچہ مشاہدہ ہے۔

بنابریں تمام اہلِ فہم اور ارباب قلم و علم سے پرزور درخواست ہے کہ مولانا

مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں۔ جب تک کہ اس کو اصول اور مسلمات اسلامیہ اور ضروریات دین اور عقائد و اعمال اہل سنت والجماعت کے زریں قواعد تالیف پر پرکھ نہ لیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف و اکابر دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضرات اکابر جملہ عقائد و اعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں یا اصول سے سلف صالحین اور ان کے اصول و قوانین مسلمہ اہل سنت والجماعت ہی کے تابع رہے اور اس کی تعلیم و تلقین کرتے رہے ہیں۔ واللہ الموفق۔ ربنا ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔ آمین ٭

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

اور

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا شیخ الہند کی تحریک اور مولانا عبیداللہ سندھی کے سفر کابل کے متعلق رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیرا ۱۶۲ میں کچھ حالات درج ہیں اگرچہ یہ حالات نہایت مجمل ہیں مگر سفر نامہ کے بعض مقامات کو حل کرنے اور حکومت کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے اس حصہ کا یہاں نقل کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک خاص غلطی یہ ہے کہ اس میں مولانا سندھی کو تحریک کا بانی اور مولانا شیخ الہند کو اس کا مؤید ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

میرے پاس جو کتاب (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ)
۱۹۲۲ء صفحہ 252 پر درج ہے

احمد

اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا۔ یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا۔ کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کر کے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اُسے تقویت دے کر برطانوی راج کو ختم کر دیا جائے۔ اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لئے مولوی عبیداللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبیداللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا۔ ادھر دیوبند ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلا دیا۔ جن لوگوں پر اس نے اپنا اثر ڈالا۔ ان

میں سب سے بڑی شخصیت مولنا محمود حسن کی تھی۔ جو مدتوں تک درس گاہ دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعہ ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس کی تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔ مولنا محمود حسن بہر حال میں دیوبند میں ہی رہے اور عبیداللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولنا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو (مولنا) محمود حسن نے میاں محمد نامی ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبیداللہ کی پیروی کی اور ہندستان چھوڑ دیا مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کی بجائے عرب کے خطہ حجاز میں پہنچ گئے۔

روانہ ہونے سے پیشتر عبیداللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اور وہ کتابیں شائع کی تھیں جن میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندستانی مسلمانوں کو فریضہ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولنا عبیداللہ) اس کے دوسرے دوستوں اور مولنا (شیخ الہند) کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے حملہ بھی کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے۔ ہم اس جدوجہد کی تفصیل بتلاتے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے مقصد

---

[1] مولنا منصور انصاری جن کا انتقال گذشتہ جنوری میں کابل میں ہوا۔ محمد عبدالقدوس

کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں لائی۔

عبیداللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب Fanatics جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبیداللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس سے جا ملا۔ یہ شخص مولنا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا۔ اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ جو مولنا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبیداللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقت حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی۔

اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ[1] نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ممبر ہے۔ ۱۹۱۴ء کے اخیر میں اسے اٹلی، سوئیزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا۔ اور وہاں سے برلن روانہ

---

[1] راجہ مہندر پرتاپ جو اگست ۱۹۴۶ء میں ہندوستان آ گئے ہیں۔

ہر دیال[1] سے ملا۔ ہر دیال نے اُسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا۔ اور اُسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔

خود مولانا عبیداللہ کو وزیر ہند اور (مولانا) برکت اللہ کو وزیر اعظم بنا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا۔ اور برلن کے راستے کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا۔ اور انگلستان امریکا اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا

---

[1] ہر دیال دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ آکسفورڈ میں تعلیم پورا کرنے کے لئے ۱۹۰۵ء میں وہ سرکاری وظیفہ لے کر انگلینڈ پہنچا۔ اس وظیفہ کی آخری قسط کو اس نے یہ کہہ کر واپس کیا کہ اُسے انگلستان کے تعلیمی نظام کی طرف سے کوئی اطمینان نہیں۔ ۱۹۰۷ء میں وہ ہندوستان آیا اور ۱۹۰۸ء میں لاہور میں ایک اس کا اجرا کر کے یہ تبلیغ شروع کی کہ ہر برطانوی چیز کا بائیکاٹ کر کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان چھوڑا اور امریکہ پہنچ کر غدر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۱۱ء میں سان فرانسسکو پہنچا۔ اور ریاست ہائے متحدہ کے مختلف مقامات پر جلسوں میں تقریریں کر کے انجمنیں قائم کیں اور ان سے عہد لیا کہ وہ ہندوستان میں انگریزی راج کا خاتمہ کریں گے۔ غدر کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کی [illegible] کا نام جگنتر آشرم تھا۔ اخبار کئی ہندوستانی زبانوں میں چھپتا تھا۔ امریکہ کے ہندوستانیوں میں تقسیم کئے جانے کے علاوہ ہندوستان میں بھیجا جاتا تھا۔ ان کاموں میں ہردیال کے کئی معاون تھے جن میں سے ایک ہندو رام چندر اور ایک مسلمان مولانا برکت اللہ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۱۴ء میں اُسے امریکن حکومت نے گرفتار کیا اور اس نے ضمانت پر رہائی حاصل کی۔ وہاں سے وہ بھاگ کر سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں ایک نوجوان ہاکرشن پلائی صدر انٹرنیشنل پرو انڈیا کمیٹی نے زیورچ کے جرمن کونسل سے جرمنی میں اینٹی برٹش لٹریچر شائع کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں یہ نوجوان جرمن دفتر خارجہ کے ماتحت

(باقی حاشیہ پر صفحہ ۵۷)۔

پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اُس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فریٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کے اخبار کو بند کر کے اُسے پروفیسری سے معزول کیا۔ اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر برادری سے جا ملا۔

۱۹۱۶ء کی ابتداء میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے۔ اور حکومت موقتہ (پروویژنل گورنمنٹ) نے روس ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے۔ جن میں روس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر (راجہ) مہندر پرتاپ کے دستخط تھے۔ اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئے۔ زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو) دکھلائی گئی ہے۔

حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے (مولانا) عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند رح) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) کام کرنے کے لئے برلن چلا گیا اور وہاں انڈین نیشنل پارٹی قائم کی۔ جو جرمن حکومت سے ملحق تھی اس پارٹی کے ممبروں میں ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھی شامل تھے۔ (رولٹ کمیٹی رپورٹ فصل نہم)

دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا ملا کر ایک لفافہ میں شیخ[1] عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیجا گیا شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعہ مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ پہنچائے جائیں۔ اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ (مولانا) محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام۔ بھاگے[2] ہوئے

---

[1] غالباً یہ اچاریہ جے بی کرپلانی کے بھائی تھے جو مسلمان ہوگئے تھے (مولانا عبیداللہ ص ۱۳۲) مولانا کے سفر کابل میں زاد راہ مہیا کرنے کے لئے ان کی بیوی اور صاحبزادی نے اپنا سارا زیور دے ڈالا تھا (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۸۳)

[2] ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لئے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ کے اسلحہ خانہ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا۔ اس تاریخ کو ہم آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے۔ ریل کے ذریعہ فیروزپور پہنچے۔ مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی (ان میں سے) پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے جاملنے کے لئے نکل چکے تھے (رولٹ کمیشن رپورٹ فصل پنجاب)

پیرا ۱۶۲: ہم نے پنجاب سے متعلق فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے پندرہ طالب علموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین کے ساتھ جا ملے۔ اس کے بعد وہ کابل گئے۔ وہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بندی میں رکھا گیا۔ اور بعد میں رہا ہو کر کڑی نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۵۹)

(مہاجر طالب علموں کے واقعات مغالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا۔ اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کے لئے بھرتی ہندوستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی۔ اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد کا قائم کرنا تھا (مولانا) محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچادیں۔ (مولانا) عبیداللہ کے خط حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود (مولانا) محمود حسن صاحب کو اس کا سالار اعلےٰ بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے۔ اور کابل کا سالار (مولانا) عبیداللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلےٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا۔ ایک کو کرنل اور چھ کو لفٹننٹ کرنل۔ ان اعلےٰ عہدوں کے لئے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہوسکی تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸) دی گئی۔ سو ہندوستان واپس آئے تین کو حکومت روس نے گرفتار کرکے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا۔ انہوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انہیں مشروط معافی مل گئی۔ ان پندرہ طلبا کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو عود واپس ہوئے۔ ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں۔ ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے یہ اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرکے ان مقامات کی بے حرمتی کرنے کا خطرہ ہے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کرکے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیے۔ دوسرے طالب علم کو تو اسی سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور ایک انگریزی اخبار کی ایک تصویر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی۔

سفرنامۂ کابل

مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی۔ چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔

۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے ہم ساتھی[1] برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے۔ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا۔ اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں اس خط کے مشمول مضمون کا ترجمہ یہ ہے

"ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کیلئے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔ اس لیے مسلمانو! اس ظالم عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو۔ اس پر حملہ کرو۔ دشمن کو مرنے پر مجبور کرنے کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ اور ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا۔ اور اُسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیئے اور آدمیوں روپوں اور ہر اُس چیز کے ساتھ ان کی امداد کی جائے جس کی ضرورت اُسے پیش آسکتی ہو۔"

---

[1] مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عزیز گل صاحب کاکاخیل، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب۔ مولانا وحید احمد صاحب۔

کابل میں ہمارے سات سال

ہندوستان سے روانگی ۱۳۳۳ھ موافق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے تخمیناً چار مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا۔ اور چار مہینے مختلف مقامات پر گذرے۔ دوستوں سے آخری ملاقات اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کے تدابیر میں معروف رہا۔ بفضلہٖ تعالٰے بلوچستان سے گذر کر ۲ اگست کی نماز مغرب سرحد افغانستان میں پڑھی۔ اور توکل علی اللہ بغیر کسی پاسپورٹ حاصل کرنے کے افغانستان میں داخل ہوا۔

افغانستان میں داخلہ جس حصۂ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ سُوراب کا علاقہ تھا۔ وہاں کے حاکم سے ملا۔ پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں شکوک پیدا ہونے لگے۔ مگر ہماری درخواست سُن کر کہ آپ ہمیں

سرکاری حفاظت سے قندھار پہنچا دیں۔ وہاں ہم حکومت کو مطمئن کر دینگے چند سوالات پوچھے۔ اس کا جواب ان کے رفع شبہات کے لئے کافی تھا۔ اس لئے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا۔ اور ہمارے قندھار پہنچانے کا سب انتظام کر دیا۔ قندھار میں ہمارے بعض آشنا مل گئے۔ ان کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا۔ اور ہمیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے مہمان رکھا۔ فقط کابل کے سفر کا نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ اسی طرح ہم ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ اتفاقاتِ زمانہ میں یہ بھی ایک عجیب بات سمجھی جائے گی۔ کہ اسی تاریخ ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء کو ہمیں کابل سے سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا۔ اگرچہ ہماری روانگی ۲۲ر اکتوبر کو عمل میں آئی۔ ان سات سال اور سات دن میں جو کچھ ہم نے دیکھا اس کا اکثر حصہ اس قابل نہیں کہ عام طور پر کتابوں میں لکھا جائے۔ لیکن کسی قدر واقعات لکھنے کو ہمارا جی چاہتا ہے۔ اس سے پہلے چند فصول افغانستان اور اس کی سلطنت کے متعلق لکھتے ہیں۔ تاکہ ہمارا مطلب سمجھنے میں آسان ہو۔

تمہید

پشتو۔ ایران اور ہندوستان کی سرحد پر ایک خاص زبان بولنے والی قوم آباد ہے۔ اسے فارسی میں پوشتانہ اور ہندی میں پٹھان کہا جاتا ہے کیونکہ اس قوم میں مختلف عناصر مخلوط ہیں۔ ترک، ایران، یونانی، ارمنی، یہودی، عرب سب قوموں کے آثار ملتے ہیں لیکن جہاں تک ہم تحقیق کر سکے۔ ہم اس قوم کو ہندی قدیم اقوام کا ایک حصہ مانتے ہیں اور "پشتو" کو سنسکرت کے فروع میں سے جانتے ہیں۔ تاریخ عینی اور کامل ابن الاثیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی قومیں اس وقت سلطان محمود کی فوج میں داخل ہوئیں۔ جبکہ سلطان نے جیپال راجہ لاہور کو شکست دے کر نعمان کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جہاں اس وقت تک ہندو بت خانے موجود ہیں۔ باوجودیکہ یہ لوگ فوج میں ابھی داخل نہیں ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے شہاب الدین غوری کے زمانہ میں اسلام قبول کر لیا تھا۔

پشتو گرامر فارسی کے مقابلہ میں سنسکرت سے زیادہ ملتی ہے فعل کا مفرد اور جمع بنانا فارسی میں فاعل کے تابع ہے۔ اور ہندی میں مفعول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

پشتو اس میں ہندی کے تابع ہے۔ پشتو حروفِ ہجا میں ایک ایسا لفظ پایا جاتا ہے۔ جسے بعض قبائل شین پڑھتے ہیں۔ اور دوسرے اسے خ کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہ حرف ہندی حروفِ ہجا میں پایا جاتا ہے۔ پٹھانوں کے بعض قبائل ایسے ناموں سے مشہور ہیں۔ جس نام کی ہندو قومیں ہندوستان میں بستی ہیں۔ جیسے بھٹر دغ لودھی ایک ہی قبیلہ کے افراد ہیں۔ جو قندھار میں بستے ہیں مسلمان ہیں۔ اور جو بلوچستان میں بستے ہیں۔ ہندو ہیں۔

افغانستان

اصل میں پشتو بولنے والے علاقے کا نام ہے۔ پرانا لفظ اوگانستان معلوم ہوتا ہے۔ اس علاقے کا ایک حصہ سلطنت افغانیہ کا اساس قطعہ سمجھا جاتا ہے۔ قندھار، قلات، غلزئی، غزنی، جلال آباد اس کے بڑے شہر ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ بدقسمتی سے ہند کے برطانوی سلطنت میں داخل ہے۔ جسے شمال مغربی سرحدی صوبہ کہا جاتا ہے۔ اور ہم اسے پشتانیہ کہتے ہیں۔ پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اس کے بڑے شہر ہیں۔ سوات، باجوڑ اس کی سرحدی ریاستیں ہیں۔

مہمند، وزیر، مسعود میں قومی حکومتیں ہیں۔ سلطنت افغانیہ کا مشرقی بازو افغانستان ہے۔ اور ہندوکش سے اوپر افغانی ترکستان ہے۔ جس میں میمنہ، بلخ، بخارا، بدخشاں واقع ہیں۔ مغربی حصہ ہرات کا صوبہ ایران کا ایک حصہ ہے۔ جو افغانوں نے فتح کر لیا تھا۔ سلطنت کے اساس نظام میں دہلی کے اکبر شاہی نظام کے دھندلے سے نشان ملتے ہیں۔ حکومت کی زبان فارسی ہے۔ جس میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ اسی طرح ترکی الفاظ کی آمیزش بھی کافی کثرت سے موجود ہے۔

دارالسلطنتِ کابل

دارالسلطنت میں ایرانی، افغانی، ترک، ہندی آباد ہیں۔ تجارت میں، زراعت میں، ملازمت میں سب شریک ہیں۔ (اس وقت ہندی سے ہماری مراد ہندو اور سکھ ہیں جو افغانستان کی آبادی کا ایک اہم عنصر ہے) ہم جس وقت کابل پہنچے اس وقت ان کے علاوہ دارالسلطنت میں اور بھی ہندوستانی ملتے تھے جنہیں ہم مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کے ہندو اور مسلمان تجارت کے لئے افغانستان میں کثرت سے آمد و رفت رکھتے ہیں۔ سندھی ہندو۔ اور پشاوری مسلمان ممتاز نظر آتے ہیں۔ پشاور میں مسلمانوں کا ایک حصہ انگریزی سرمایہ سے تجارت کرتا ہے ان کے گماشتے افغانستان پر چھائے ہوئے ہیں۔

(۲) بہت پرانے زمانے سے لے کر افغانستان سے عربی زبان میں تکمیلِ علم دین کے لئے اکثر طالب علم ہند کے دینی مدارس میں آتے ہیں۔ یہ لوگ ہندی زبان جانتے ہیں۔ ہندوستانیوں سے زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں۔

(۳) جب سے امیر حبیب اللہ خاں نے یورپین علوم و فنون کی ترویج پر توجہ فرمائی ہے۔ اس وقت سے معلمین کی ایک جماعت کابل میں ہمیشہ رہتی ہے یہ لوگ اکثر پنجابی ہیں۔

(۴) ان کے ساتھ پنجابی مسلمان طبیبوں کی بھی ایک جماعت ہے۔ جن میں ایک آدھ اچھا ڈاکٹر ہے۔ باقی سب کے سب کمپوڈر یا ڈاکٹر نما طبیب ہیں انہیں بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اور پرائیویٹ معالجہ سے بھی کافی روپیہ کما لیتے ہیں۔

(۵) کابل میں چند ہندوستانی معلم ایک سیاسی سازش کے الزام میں مشروطیت پسند افغانوں کے ساتھ جیل میں مقید ہیں۔

(۶) پنجاب کے کالجوں سے چند تعلیم یافتہ نوجوان ترکی کی حمایت میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ جو پولیس کی حفاظت میں کابل میں رہتے ہیں۔ اس زمانے میں میرے دو معزز دوست شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے اور مولوی محمد علی قصوری ایم۔ اے تعلیمی صیغہ ملازمت کے لئے کابل پہنچ گئے اور حبیبیہ سکول میں کام پر لگائے گئے۔ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میں نے اپنا عزیز بھتیجا عزیز احمد ابن حبیب اللہ کو بھی کابل روانہ کر دیا تھا۔ کہ وہیں حبیبیہ سکول میں تعلیم حاصل کرے۔

(۷) اکتوبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتے میں ہندوستانیوں کا ایک سیاسی مشن کابل پہنچ چکا ہے۔ جس میں ترک اور جرمن بھی شریک ہیں۔

اعلیحضرت امیر حبیب اللہ خاں (شہید) اگر امیر کی پرائیویٹ زندگی سے قطع نظر کیجئے تو انہیں شاہ اصلاح پسند کہنا چاہیئے ہمیں اپنی اس رائے کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر امیر عبدالرحمٰن کے بعد امیر شہید جیسا بادشاہ نہ آتا۔ تو افغانستان میں کبھی بھی موجودہ ترقی کا دور جاری نہ ہو سکتا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے دو

لہ ۱۹

مدرسے حبیبیہ حربیہ اور دو شفاخانے۔ ملکی، نظامی نئی طریقے پر بنائے۔ حبیبیہ سکول کا نظام تمام تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ حافظ احمد الدین بی۔ اے اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے کو میں نے انہیں کے معرفت کابل بھجوایا تھا۔ اس کے ساتھ مولوی محمد علی قصوری ایم۔ اے کو حافظ جی اپنے انتخاب سے لے گئے تھے۔

حربیہ سکول کا انتظام ترک افسروں کے قبضہ میں تھا۔ اسی طرح ملکی شفاخانے کا افسر ڈاکٹر میر عزت بیگ بھی ایک شریف ترک تھا اور نظامی شفاخانہ ایک ہندوستانی ڈاکٹر اللہ جوایا خاں کے پاس تھا۔ لیکن عملہ دونوں شفاخانوں کا ہندوستانی تھا۔ امیر صاحب نے ایک دو نہایت عالیشان عمارتیں بنوائیں جن میں کچھ یوروپین انجنیئر بھی کام کرتے رہے۔

معاش خانہ معاش خانہ جو امیر عبدالرحمٰن خاں نے بنایا تھا۔ اس میں افغانی۔ ترک۔ ہندوستانی کام کرتے رہے۔ امیر شہید نے اسے برقی قوت سے چلانے کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ جبل السراج میں برقی قوت پیدا کرنے کا اول درجہ کا معمل تیار کر دیا ہے۔ لیکن اجنبی انجنیئر کام کی تکمیل میں روڑے اٹکاتے رہے۔

اعلیحضرت امیر امان اللہ نے استقلال کے بعد چند روز میں کام جاری کر دیا۔ اور اس تکمیل کا سہرا ایک ہندوستانی مسلمان انجنیئر کے سر بندھا گیا

امیر شہید نے سراج الاخبار جاری کیا تھا جس کی ادارت کی باگ چند روز بعد سردار محمود طرزی کے سپرد کی گئی۔ سراج الاخبار کے مطبع میں ہندوستانی اور مصری کام کرتے رہے۔ امیر شہید کے اصلاحی کام کا قطبِ مدار اگر سردار محمود طرزی کو قرار دیا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔ میں اُن کی زندگی کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہوں۔ اصلاح افغانستان میں جس قدر ثابت قدمی سے اس مردِ خدا نے جہاد کیا ہے۔ اس کی نظیر مشرقی اقوام میں بہت کم ملے گی۔

امیر شہید نے شرفاءِ افغانستان کی زندگی کی اصلاح و ترقی میں نمایاں کام کئے۔ کابل سے باہر آپ ایک ایک گھر معمولی حیثیت میں پائیں گے۔ مگر اندر جا کر دیکھیں تو نہایت صاف منتظم آراستہ ایک نمونہ ہوگا۔ امیر شہید اگرچہ اعلیٰحضرت شاہِ افغانستان کا مسلّم لقب رکھتے تھے۔ مگر سوائے ایک انگریزی معمولی قونصل کے جو عموماً ایک پنجابی مسلمان ہوتا۔ اُن کے دربار میں کسی دوسری دولت کا رسمی طور پر کوئی آدمی نہیں رہتا تھا۔ البتہ مسلمان حکومتوں کے معزز افراد کابل میں اپنی شخصی حیثیت سے ممتاز نظر آتے تھے۔

سردارانِ سلطنتِ افغانیہ

امیر شہید کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خاں صاحب نائب السلطنت اور امیر شہید کے بڑے صاحبزادے سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت

اور منجھلے صاحبزادے سردار امان اللہ خاں معین الدولہ امورِ سلطنت میں حسبِ مدارج شریک تھے۔ مثلاً صوبے کا حاکم نائب الحکومت امیر صاحب خود متعین فرماتے تھے۔ اس کے ماتحت ہر ضلع کا حاکم سردار نائب السلطنت کے انتخاب سے مقرر ہوتا تھا۔ شرعی فیصلہ کے لئے قاضی سردار معین الدولہ کی طرف سے مامور ہوتا تھا۔ عمومی فوجی بھرتی جسے ہشت نفری کہا جاتا ہے سردار معین الدولہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ان سرداروں کے علاوہ امیر عبدالرحمٰن خاں کے زمانہ سے ایک وزیر جو اس وقت معمر ہونے کی وجہ سے پنشن پاتے تھے۔ سردار اعتماد الدولہ عبدالقدوس خاں ہیں۔ شاہی خاندان جس قبیلہ کی برانچ ہیں۔ اُسے محمد زئی کہتے ہیں۔ سردار اعتماد الدولہ باعتبار اپنی بزرگی کے تمام محمد زئی کے قومی بزرگ ہیں۔ اس حیثیت سے امیر صاحب بھی ان کے اعزاز اپنے بزرگوں کی طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ مثلاً عید کے روز خود امیر صاحب ان کی خدمت میں جاتے تھے ان کے لئے سلام خانہ کی حاضری معاف تھی۔ سردار اعتماد الدولہ کے دو بھتیجے محمد یوسف خاں اور سردار محمد آصف خاں مصاحبانِ خاص کے لقب سے ملقب تھے۔ اور امیر شہید کے مجالس میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ سردار محمد یوسف خاں کے بڑے صاحبزادے سردار محمد نادر خاں سپہ سالار ہیں۔ مصاحبانِ خاص کی اولاد میں سے آٹھ دس نوجوان شائستہ باہمت کارکن ہیں۔ دوسرے درجہ کے

تمام مناصب اکثر انہیں بھائیوں کے ہاتھ ہیں۔ امیر شہید کی حکومت اور ان کی اصلاحات کو کامیاب بنانے میں اس خاندان کا ممتاز حصّہ ہے۔ اور اس کا کریڈیٹ سردار محمد نادر خاں کو دینا چاہیئے۔ سردار محمد نادر خاں تمام ہندوستانیوں کے محسن اور سرپرست ہیں اور میں تو خاص طور پر اُن کا ممنون ہوں۔ اگرچہ ظاہر میں ان سے بہت کم تعلق رہا لیکن میرے ہر مشکل معاملہ میں مدد کرتے رہے۔ اور لطف یہ ہے کہ نہ کبھی اس کا اظہار کیا نہ ستائش کی تمنّا۔ نہ صلہ کی پروا جس طرح سردار محمود طرزی ترکی معاشرت کے دلدادہ ہیں اسی طرح سردار محمد نادر خاں ہندوستانی معاشرت کے حامی اور پروانہ ہیں۔ ان حضرات کے سوا شاہی خاندان اور محمد زئی کے قبیلہ میں بہت سے سردار ہیں دوسرے افغانی قبائل اور ایرانی خاندانوں کے شرفا اس قدر زیادہ ہیں۔ کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں شرفاء کی اتنی مقدار مجتمع نہ مل سکے گی ◆

باب اوّل

کابل کی اہمیت
ہمارا کابل پہنچنا
ہمارا تعارف
سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی۔
اعلیحضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے حضور میں باریابی
ہندوستانی مشن سے ملاقات

کابل کی اہمیت

اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ کہ ہندوستانی آزادی پسند لوگوں کے لئے عموماً سب سے زیادہ موزون مرکز دارالسلطنت کابل ہے۔ اسے ہندوستان کے متقلب حکمران ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ دہلی کی سلطنت گو آخر میں ضعیف ہو گئی تھی۔ لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت انگریزوں کو اُس وقت تک نہ ہو سکی۔ جب تک انہوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے دہلی اور کابل کا اتصال نہ توڑ دیا۔ اس سے پہلے مرہٹوں کا قبضہ توڑنے کے لئے دہلی نے کابل اور قندھار سے مدد حاصل کر لی تھی۔ جس میں نجیب الدولہ کا خاص ہاتھ تھا۔ سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے علم میں ایک طرح کا اضافہ ہوگا۔ جب انہیں یہ بتایا جائے کہ نواب نجیب الدولہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے خاص معتقد تھے۔ اور ان کی سیاسی فلاسفی

کو ایمان کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے۔ دوسری دفعہ جب انگریزوں نے دہلی پر تسلط جما لیا تو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی کے وابستگان حضرت امیر شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کے رفاقت میں اسی حجاب کو اُٹھانے میں مصروف رہے۔ اور قندھار کابل کے راستہ پشاور پہنچ کر دو چار سال کوشش کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

ہمارا کابل پہنچنا

ہم نے جس حالت میں ۱۳۲۷ھ سے ہند میں زندگی بسر کی۔ اس سے حکومت ہند اچھی طرح واقف تھی ہمارا نصب العین کسی سے مخفی نہ تھا، مگر ہمارا کام اتنا تیز نہیں رہا تھا جس سے حکومت ہمیں معطل کرنا ضروری سمجھتی۔ ہماری محبت میں جو لوگ سی۔ آئی۔ ڈی کے مقرر ہوئے تھے۔ ان سے ہمارا برتاؤ اچھا رہا۔ اس کا بھی ہماری آزادی میں کافی اثر ہے۔ کابل جانے کا فیصلہ ہم نے مخفی اپنے اُستاد، مُرشد، مربّی حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کو راضی رکھنے کے لئے کیا تھا۔ ہم اپنی حیثیت و طاقت سے واقف تھے۔ ہم نے بڑی بڑی اُمیدیں تصوّر کر کے کبھی مسرور ہو کی کوشش نہیں کی۔ ہم تصوّر نہیں کر سکتے تھے کہ کابل پہنچ کر ایک سال سے کم عرصہ میں ہم اپنا مافی الضمیر کسی ذمہ دار افسر سے کہہ سکیں گے۔ اگر خوش ہوتے تو صرف اس پر کہ خدا نے ہمیں اپنے بزرگ کا حکم مان کر ملک چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت مولانا کا ذکر ہم ہر ایک دوست سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے بعض دوستوں سے جو اس خیال کے مؤیّد تھے کبھی ہم اُن کا نام ذکر کر دیتے تھے۔ یا اپنا طبعی رجحان ایک مسلم حکومت میں جا لینے کا ذرا تفصیل سے سنا دیتے تھے۔ اسی طرح پر ہم خاص دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہماری طرح کے آدمیوں کو ہندوستان کے حکمران، کابل میں کس قدر بدنام کرتے ہیں۔ اِس سے ہم واقف تھے۔ پہلے سے چند ہندوستانی ایک سیاسی سازش کے الزام میں محبوس ہیں۔ اس کا جو اثر ہماری پوزیشن پر پڑتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ہے۔ ان حالات میں جس قدر احتیاط کرنی چاہیئے، ہم نے اس کا کافی انتظام کر دیا تھا۔ قندھار تک تو ہم بلا پاسپورٹ حکومت کی نگرانی میں پہنچ گئے۔ اس وقت سردار محمد یونس خاں قندھار کے نائب الحکومت تھے۔ جو سردار اعتماد الدولہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے۔ جو نائب الحکومت سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ اِن میں سے ایک صاحب ہمیں سندھ میں مل چکے تھے۔ اِس نائب الحکومت سے ہماری اچھی ملاقاتیں ہوئیں بعض علمی مسائل کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اگرچہ مثنوی مولانا روم سے ہمارا اشتغال بہت کم رہا ہے۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ اس امتحان میں کامیاب رہے۔ نائب الحکومت نے ہمیں خاص راہداری دی۔ اور اوّل درجہ کے سفر کا انتظام کر دیا۔ اپنے پرائیویٹ دوستوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود طرزی کو اطلاع بھیج دی تھی۔ اس لئے

ان کا آدمی ہمیں شیخ محمد ابراہیم کے یہاں سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے لئے آیا۔ وہ نوجوان سردار عبدالہادی خاں تھا۔

ہمارا تعارف

شیخ محمد ابراہیم کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں اُترے اور اُن کے توسط سے اُن سب لوگوں سے مل گئے جن کے لئے ہمارے پاس خطوط تھے۔ اس میں قابلِ ذکر سپہ سالار محمد نادر خاںؒ اور سردار محمود خاں طرزی تھے۔ سردار سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا۔ اور ہمارے قیام کابل میں جو سرکاری مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اُن کے زائل کرنے پر اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا۔ کہ ہم بظاہر سپہ سالار سے اجنبی ہیں۔ اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ سردار سپہ سالار کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا ہے۔ اِس لئے ان کا ہر قول و عمل اخلاص و محبت پر مبنی تھا۔ ترکی کے شریکِ جنگ ہونے کا اثر سردار محمود خاں طرزی پر نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اس لئے ہمارا رابطہ اُن سے زیادہ ہوتا گیا۔

انہوں نے ہمیں سردار معین السلطنت سے ملایا۔ اور ایک دن سردار کی معیت میں کھانے پر بلایا۔ اِس سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ اس کھانے کے بعد ہم نے پورا ایک دن چھری کانٹا استعمال کرنے کی مشق میں صرف کیا۔ اور بے تکلف دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔

سلطنتِ افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے۔ جسے میزان التحقیقات

شرعیہ کہتے ہیں۔ اس محکمہ کا رئیس قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم (دیوبند) کا تعلیم یافتہ ہے۔ حدیث حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سے پڑھی تھی۔ وہ سردار نائب السلطنت سے خاص طور پر وابستہ ہیں۔ جیسے سردار طرزی معین السلطنت سے اور سردار سپہ سالار اعلیحضرت سے۔ قاضی عبدالرزاق خاں سے ہم چند روز بعد ملے مگر پُرانے علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات وہاں ہمیں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص طور پر اُن کے پاس اطلاعات موجود تھیں۔ انہیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔

سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی

حاجی عبدالرزاق خاں چاہتے تھے۔ کہ ہمیں سردار نائب السلطنت سے ملائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے غیر رسمی پولیٹیکل معاملات سردار نائب السلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ فقط رسمی معاملات اعلیحضرت کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے وہاں کے حالات کے مطابق، انہیں مشورہ دیا کہ ہماری ملاقات سردار معین السلطنت کے توسط سے ہونی چاہیئے۔ اسے انہوں نے پسند کیا۔ اور ہم سے ایک مختصر عریضہ لکھوا لیا جس میں ہم نے اپنے مقاصد کا بالاجمال ذکر کیا۔ اِس کے ایک روز بعد مجھے سردار معین السلطنت اپنے ساتھ لے گئے۔ سردار نائب السلطنت ہم دونوں سے تخلیہ میں ملے اور دو گھنٹہ تک

مفصل حالات سنے سوالات کئے۔ جوابات سے مطمئن ہوئے۔ یہ ایک طرح کا ہمارا امتحان تھا جس میں ہم بفضلِ خداوند تعالےٰ عزّوجل اچھے کامیاب رہے۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سردار نائب السلطنت ہماری گفتگو سے محظوظ ہوئے اُن کی خواہش تھی کہ اس مذاکرہ کا خلاصہ فارسی میں لکھ کر ہم اُن کے سامنے پیش کریں۔

میں اسلامی تاریخ کا عموماً مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اور ہندوستانی تاریخ سلطانِ عالمگیر اور اس کے بعد کا دور میرا خاص مضمون ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی علمی وسیاسی تحریکیں یہاں سے شروع ہوتی ہیں لیکن یوروپین طریقہ پر سیاسیات کا مطالعہ مجھ کو زیادہ میسّر نہیں ہوا۔ اُردو یا فارسی عربی میں اس نئی طرز کو سمجھنے کے لئے بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ اس لئے ایک عرصہ سے سیاسیات سے واقف تعلیم یافتہ کا اشتراک اپنے لئے ضروری سمجھتا ہوں شیخ محمد ابراہیم نے تاریخ اقتصادیات میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کابل آنے سے پہلے ہم نے سیاسی اشتراک اُن سے پیدا کیا تھا اور وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر حبیبیہ سکول میں ملازم ہو چکے تھے۔ اس زمانہ فقط وہ میرے مشیر تھے میں نے بہت احتیاط سے اس پندرہ دن میں سات آٹھ صفحے لکھے۔ اور شیخ محمد ابراہیم کو سنائے۔ اُنہوں نے بعض مفید اضافے کئے۔ اور ہم نے مضمون سردار طرزی اور معین السلطنت

کے معرفت سردار نائب السلطنت کے پاس بھیج دیا۔ سردار نائب السلطنت ہمارے طرزِ تحریر سے سمجھ گئے کہ جب تک ہمارے معاملے کا فیصلہ خود اعلیحضرت نہ کریں گے ہم اسے قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے شاید ایک ماہ بعد ہمیں اعلیحضرت کے حضور میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔

اعلیحضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے حضور میں باریابی

ایک دن سردار نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارۃ میں بلایا اور عصر کے بعد وہیں اعلیحضرت تشریف لائے۔ اعلیحضرت اور سردار نائب السلطنت کے سوا اس کمرے میں اور کوئی آدمی نہ تھا جس میں مجھے شرفِ باریابی حاصل ہوا اس مجلس میں فقط دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ ایک پر اعلیحضرت جلوہ فرما تھے۔ اور دوسرے پر مجھے بیٹھنے کا حکم نہایت شفقت ومحبت سے دیا۔ سردار نائب السلطنت نے میرا عریضہ اعلیحضرت کے حضور میں پیش کیا۔ آدھ گھنٹے تک اعلیحضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ فقرات سے بہت متاثر ہوئے۔ اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کام کرنے کے لئے زبانی ایک حکم ارشاد فرمایا جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔ مجھے یہاں صرف صراحت اعتراف کی ضرورت ہے۔ کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ مجھے نہ ملتا۔ تو میری بات اس قدر مؤثر نہ ہوتی۔ اور میں اپنے

آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا۔ اور چند دنوں بعد مجھے مسلکِ ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی۔ اور میں اپنے درجہ سے بہت کچھ چھوٹا سمجھا جاتا۔ اعلیحضرت نے میری عزت افزائی سے یقیناً ہندوؤں پر احسان فرمایا لیکن نہ اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا فرضی نمائندہ بنا لیا تھا۔ بلکہ اس میں قابلِ عزت یہ بات سمجھی گئی۔ کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا اس میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا۔ اعلیحضرت کو جس قدر بذاتِ خود واقفیت تھی۔ ہمارا بیان اس کے قریب رہا۔ ایک محکوم ملت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح معلومات کا مالک ہے۔ اور ایسے نازک موقع پر صداقت کا خیال رکھتا ہے۔ اعلیحضرت کے لئے اور اس کے سردار نائب السلطنت کے لئے واقعی ایک نادر اور مؤثر مثال تھی۔ میں اسے اللہ تعالےٰ عزّ وجل کی ایک خاص رحمت سمجھتا ہوں۔ جس میں حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کی دعا اور ان کی تعمیلِ حکم کی برکت کا بہت کچھ دخل ہے۔

ہندوستانی مشن سے ملاقات

حرب عمری کے شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی آزادی سوز یورپ میں موجود تھے۔ وہ سب برلن میں جمع ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے جرمن[1] دفتر خارجہ کے ماتحت

---

[1] ڈائری کے اصل مسودہ میں یہاں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ اور دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ تسلسل کو رولٹ کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر مجملاً یوں باقی رکھا جا سکتا ہے۔

ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی تھی۔ ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ اس میں شامل تھے۔

اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیر اہتمام راجہ مہندر پرتاپ اور اس کے رفقاء کو جن میں مولوی برکت اللہ صاحب بھی شامل تھے۔ جلد ترکی اور جرمنی افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا تھا۔ اور ان کی مفصل ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں۔ جب ہم اعلیحضرت کے حضور میں پیش ہوئے۔ اس کے بعد ہم کو مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت ہو گئی۔ اور ہم ان سے اچھی طرح مل سکے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستانی معاملات میں ہمارے اور اُن کے نقطۂ نظر میں کسی قدر فرق ہے۔ اس طرح مشن کے جرمن ممبروں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ اور اپنے نقطۂ نظر کے منوانے کے لئے ہم ایک طویل زمانہ تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ اس زمانے میں ہمارا ترجمان ہندوستانی نوجوانانِ مہاجرین میں سے ایک نوجوان تھا۔ جسے ان لوگوں نے اپنا پریذیڈنٹ منتخب کر دیا تھا۔ اس کا نام عبدالباری تھا۔ وہ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے پڑھتا ہوا چلا آیا تھا۔ شیخ محمد ابراہیم چونکہ حبیبیہ سکول میں ملازم تھے۔ اس لئے اُن کو سیاسی مجالس میں عام طور پر شامل ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی اور جرمنی ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یورپین

سائیکالوجی کے لئے نہایت دلفریب تھے۔ ترک اور جرمن جب تک برلن اور استنبول میں جیسے ہم پہنچے ان نظریات کی بہت قدر کرتے رہے لیکن کابل میں تو عملی کارروائی کے لئے آئے تھے۔ اس میں مشن کے پریذیڈنٹ یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان، صوبہ سرحد پنجاب، سندھ، بلوچستان کا نقشہ دیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں ملے مگر بتدریج اُن کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہوتا گیا۔ ہماری ساری عمر شمال مغربی ہند میں گذری۔ اور اسی ادھیڑ بن میں ہر کہ او مہ سے ملتے رہے۔ ہمارے پاس بعض ایسی معلومات بھی تھیں۔ جو کابل میں فوجی نقطۂ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔ اس طرح ہماری رائے غالب ہونے لگی۔ اس اختلافِ خیالات سے قطع نظر ہم نے ہندوستانی ممبروں کے احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اس لئے روز بروز ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔

باب دوم

اس ضروری مسئلہ کے محرکات
تمہیدی مقدمات کی تکمیل
ہندو مسلم اتحاد
ہندوؤں کی ایک غلط فہمی
کانگرس کے ایک لیڈر کی رائے
راجہ مہندر پرتاپ
راجہ صاحب کا حملہ
لالہ لاجپت رائے کی ملاقاتیں
استنبول میں
جرمن ممبروں کی شکایت
ہندوستانی مشن کا مقصد

راجہ صاحب سے تبادلۂ خیالات کرنے پر ہمیں ایک ناگوار حقیقت کا علم ہوا۔ ہم ہندوستان میں بھی اس سے کسی قدر واقف ہو چکے تھے مگر اس کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا تھا۔ اب ہمیں اس کے اثر اور وسعت کا حقیقی علم حاصل ہوا۔ اس مسئلہ میں ہمارے تبادلات سمجھنے میں ناظرین کی آسانی کے لئے ہم کسی قدر گذشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے۔ کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن جب مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عملی حصہ لینے کے لئے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں

اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی۔ اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی۔

اس ضروری مسئلہ کے محرکات

میں جس وقت ناظم جمعیت الانصار تھا میرے ایک سندھی دوست پروفیسر جیوت رام کرپلانی دیوبند تشریف لائے۔ وہ دار العلوم دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے۔ انہیں پوری آزادی سے دار العلوم کی سیر کرائی۔ آخر میں وہ دار العلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کار آمد ہو سکتی ہیں۔ وہ اسی قسم کے کام ہیں۔ اور دار العلوم کی خدمات قابلِ تعریف اہمیت رکھتی ہیں۔ اس پر میں نے سوال کیا کہیے پروفیسر صاحب ہماری ضرورت ہے یا نہیں۔ ان کا جواب تھا بالکل نہیں۔ آپ اگر ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں ورنہ ہند ہمارا ہے۔ اور ہم اپنا کام خود کر لینگے اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے۔ کہ اچھا نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے مجھے بے قرار کر دیا۔ چند روز بعد ہمارے مؤتمر الانصار کا اجلاس مراد آباد میں قرار پایا۔ بحیثیت ناظم مؤتمر الانصار مجھے شرفاء مراد آباد سے ملاقات کے مواقع ملے بفضلہ تعالیٰ ہمارا جلسہ کامیاب رہا۔ علی گڑھ کے پروفیسر جلال الدین صاحب جو ہمارے کاموں کو ابتداء سے اچھی طرح دیکھ رہے تھے ان سے میں نے مؤتمر کی نسبت سوال کیا۔ انہوں نے بہت تعریف کی۔ اس پر میں نے ان سے وہی سوال دہرایا۔

کیوں ہماری ضرورت ہے یا نہیں؟ پروفیسر نے نہایت محبت آمیز متانت سے جواب دیا۔ آپ کے سوا تنہا ہم کچھ نہیں ہیں۔ اس جواب کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ اور میں نے دل ہی اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو سخت ملامت کی کہ تعلیم یافتہ جماعت سے ہم کیوں کھچے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا پروگرام میرے سامنے آگیا۔ اس کی پہلی کڑی قدیم و جدید نوجوانوں کا سمجھوتہ ہونا چاہیئے پھر دوسرا قدم اٹھانا اس قدر مشکل نہیں رہے گا۔

تمہیدی مقدمات کی اپیل

پرانے اور نئے خیال کے مسلمانوں میں محلِ نزاع کیا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ علماء یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ عام مسلمانوں کی راہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے نکلے اور صرف تعلیم یافتہ طبقہ لیڈر شپ کا مدعی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ علماء کی امامت میں ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اہلِ علم لیڈر شپ کے ادعا سے دست بردار ہو جائیں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہلِ علم کی شمولیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے اُستاد حضرت مولانا شیخ الہند تغمدہ اللہ بغفرانہ نے میرے خیال کی اس طرح داد دی تھی۔ کہ وہ پہلے سے اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی مرحوم گورنر یوپی کی آمد پر دیوبند تشریف لائے۔ تو حضرت

مولٰنا[1] خود اُنؒ سے ملنے کے لئے اُن کے قیام گاہ پر گئے۔ اُسی وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی مرحوم کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ میں اُس وقت دیوبند میں نہ تھا۔ اور نادان لوگوں نے حضرت کے اِس تقدم پر نکتہ چینی بھی کی تھی ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا خدا بھلا کرے۔ جو علماء دیوبند اور تعلیم یافتگان علیگڑھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ وہ جب ہلال احمر کا وفد لے کر گئے۔ تو اُس میں علمائے دیوبند بھی شریک ہوئے۔ اور اسی کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک (حکیم اجمل خاں) مغفور تھے۔ میں جب دہلی آیا۔ اور مسیح الملک کی سرپرستی میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ تو اُس میں نواب وقار اور حضرت شیخ الہندؒ دونوں ایک درجہ پر شریک ہوئے۔

ہندو مسلم اتحاد

اس مرحلہ کے طے ہونے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کر دیا۔ اور اس میں اعلٰے درجہ کی کامیابی ہوئی۔ اور مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔ میں ہندو دوستوں کے خیالات جانچتا رہا۔ ان میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ پروفیسر کرپلانی جب دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے۔ تو ان کی ذہنیت اور ہی تھی۔ انہوں نے مجھے دعوت دی۔ کہ اگر میں چاہوں تو تمام ہندوستان کا مطالعہ کر سکتا ہوں۔

---

[1] گورنر یوپی کے آمد وقت مولٰنا شیخ الہندؒ دیوبند سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ مولٰنا محمد علی مرحوم سے ملاقات غالباً گورنر قیام دیوبند سے کچھ پہلے یا بعد میں ہوئی ہو گی۔

اور وہ میرے لئے انتظام کر دیں گے۔ اِن واقعات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا۔ کہ اِس قسم کی غلط فہمی ہندوؤں میں کافی طرح موجود ہے لیکن وہ ناقابل علاج نہیں۔ تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی ہے میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں یہ پروپیگنڈا پھیل چکا ہے۔ اور ہمارے ہندو بھائی جب ہندوستان کا تعارف کراتے ہیں تو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہندوستانی ملاقات کے وقت رام رام کیا کرتے ہیں۔

ہندوؤں کی ایک غلط فہمی

تاریخ پڑھکر ہندو نوجوان یہ نظریہ قائم کر لیتے ہیں۔ کہ ہندو اصلی ہندوستانی ہے اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہے۔ اِس لئے جب وہ ہند کو بیرونی لوگوں سے متعارف کرنے کا خیال کرتے ہیں۔ تو اِس میں مسلمانوں کو بیرونی فرض کر لیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفا کی ایک بڑی جماعت عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے۔ اور اُن کی زبان سے بھی بعض اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں۔ جس سے ہندو نوجوان کو اپنے تخیل کی سند مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت کے متعلق ناواقف نہ ہوں گے۔ کہ میں ایک ہندو گھر میں پیدا ہوا۔ اور ہندو نومسلم کی کتاب تحفۃ الہند میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت میں یقین کر کے سولہ برس کی عمر میں[1]

---

[1] بریکٹوں کے اندر کا اضافہ دوسرے سوانح نگاروں کی رو سے کیا جاتا ہے۔

(مسلمان ہُوا۔ اور تئیس سال کی عمر میں) علوم دینیہ میں تکمیل کر کے دارالعلوم دیوبند سے سندِ فضیلت حاصل کی ہیں علمی تحقیقات سے اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی خصوصاً طبقۂ سافلہ، کاشتکار، مزدور ہندو بزرگوں کی اولاد ہے۔ جو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اور جو بزرگ فاتحانہ ہند میں داخل ہوئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور جو خاندان اِس نئے مذہب اور تمدّن کو ہند میں قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُن کی اولاد اوّل درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوموں کا نو مسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے بھائیوں کو بہت جلد اِس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیئے۔ میرا یقین ہے۔ کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لئے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی تمدن، کوئی قانون میسّر نہیں آسکتا۔ اس لئے ہندوستانیوں کو اسے عزّت سے مان لینا چاہیئے لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم نو مسلم کیا ایسے بھی گئے گذرے ہو گئے اور اپنی آبادی کے تناسب اپنے مذہب کی عزت تمام بھائیوں سے نہ منوالیں ایک ہندوستانی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر زیادہ شریف تصوّر کرتا ہے۔

کانگریس کے ایک لیڈر کی رائے

مسلم لیگ کا ڈیپوٹیشن جب شملہ گیا۔ تو مسٹر گوکھلے نے مسلمانوں کو اپنی تعداد سے زیادہ نمائندگی مانگنے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے

اس سے میرے دل میں یہ بات ٹھیک طور پر بیٹھ گئی۔ کہ واقعی انصاف کے رو سے ہمیں اس قدر نمائندگی پر راضی ہونا چاہیئے جس قدر شری یت کرشن گوپال گوکھلے ہمارے لئے مانتے ہیں میں نے راجہ صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے۔ وہاں کوئی کارروائی مسلمانوں کے فیصلہ کے بغیر نہ ہونا چاہیئے اس طرح یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ سارے برِّاعظم کو اکائی مان کر میجارٹی کے فیصلہ کردہ لوگ ہندوستان جانتے ہیں۔ انہوں نے ہماری تل بات سنی۔ اور اعداد و شمار میں غور کیا تو اُن کی رائے ہمارے موافق ہو گئی۔ جرمن کیپٹن نے کہا۔ کہ ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے۔ دوسری دفعہ نہیں کرے گی۔

ہمارے راجہ صاحب ہیومینٹیرین (HUMANI--TARIAN) **راجہ مہندر پرتاپ** ہیں، اور اسی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ لیکن اعلےٰ انسانیت کا معیار اُنکے ذہن میں ایک ڈکٹر سیاسی سے اونچا نہیں ہے اُنکے نزدیک ہندوستان میں دیر[1] ابتدائی مطالعہ کے مقابل مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ کابل میں مہمانوں کی رواداری ایک مرض کے درجہ تک ترقی کر چکی تھی۔ وہ مہمان کی بات صریحاً غلط سمجھ رہے ہیں مگر اپنے آپ کو جاہل سمجھ کر مہمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری جانتے ہیں۔ عام مجلسوں میں اُن کی غلط باتوں کی تائید کیلئے شاعروں کے مقولے پیش کر دیں گے۔ اس سے مہمان سمجھ رہا ہے کہ میرے پروپیگنڈے کا خوب اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے راجہ صاحب بھی اس غلط فہمی میں کافی زمانہ تک مبتلا رہے

---

[1] بین القوسین (الفاظ سمجھ میں نہیں آئے)

یہ کہنا بیجا نہیں ہے۔ کہ میرے تبادلۂ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا۔ کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کرے۔ اور میں اُن کے لئے ایسا نرم اور میٹھا ثابت نہیں ہوا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم۔ اس کے بعد ہمارے اور راجہ صاحب کے اکثر معاملات محبت سے طے ہوتے رہے اور میں نے اُن کے معاملہ کو پروفیسر کرپلانی کی طرح معمولی تصور کیا۔ (یعنی ایک غلط فہمی) اور ادلّہ کی روشنی میں اس کی درستی کر دی گئی

راجہ صاحب کا حملہ[1]

مگر واقعہ ایسا نہیں تھا۔ انہوں نے ہندو مہا سبھا کا نظریہ اس وقت سے قبول کر لیا۔ یا صحیح طور پر کہا جائے تو انہوں نے اپنے قلبی فیصلہ کو عملی صورت دینا شروع کی (یعنی آریہ سماج کو ہراول بنا کر لالہ ہردیال کے نام سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے کافی محنت کے بعد اپنے بھائی سے سوئیٹزرلینڈ میں ملاقات کی صورت نکالی۔ اور انہیں نشیب و فراز سمجھا کر واپس کر دیا۔ راجکمار شاردھا کالج لاہور میں جلوس اور پنڈت مالوی جی کا لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند سے جیل میں مل کر انہیں معافی کے لئے تیار کرنا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں راجہ صاحب کا ہاتھ کام کر رہا ہے

لالہ لاجپت رائے کی ملاقات استنبول میں

راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت موقتہ ہند کی کتاب سوئیٹزرلینڈ

---

[1] یہ اور اسکے بعد کا عنوان۔ اُن واقعات کی طرف کچھ اجمالی اشارے ہیں جو کابل کے سفر سے متعلق نہیں۔

کے سفر میں چرائی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ وہ بھی پنڈت جی تک پہنچ گئی ہے۔ یا پہنچا دی گئی ہے۔ اس سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں اُن کا عام پروپیگنڈا آسان نہیں فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گہرے واقعات کیسے معلوم ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لئے لالہ لاجپت رائے ہم سے ملے۔ اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جا سکتی ہے۔ ہماری ملاقات سے لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا جس میں افسوس کہ انہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں پر یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔

مفصل ملاقاتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مشن

جرمن ممبروں کی شکایت

کے ہندوستانی ممبر اور جرمنی ممبر یک جہتی قائم نہ رکھ سکے۔ جو ایسی سیاسی مہمات کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے تھے۔ لیکن جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلن اور استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے۔ اُن کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ اس مشن کا جو مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ انصاف یہ ہے۔ کہ مشن نے اس کے موافق کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ راجہ صاحب کو جب میں نے بعض کوتاہیوں سے متنبہ کیا۔ تو فرمایا کہ جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی۔ اور میرے لئے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی۔ مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا۔

ہندوستانی مشن کا مقصد

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا

کہ جرمنی اٹلی کی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمائندہ اس سے واقف ہوتا رہے اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے۔ معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو۔ اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانشمندی سے اس ہندو تحریک کو ہندوستان کا رنگ دینے کے لئے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی برائے نام اس میں شریک کیا۔

مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم ہیجنی دکھلاتے ہیں۔ اسکا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے۔ جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کر کے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کے ذہن میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس بتکدہ کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تو اس شخص کے بیکار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے میں اپنا مطلب واضح کرنے کیلئے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں۔ تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ڈاکٹر انصاری اگر سوامی شردھانند کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو اس کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے۔ اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے ◆

باب سوم

جنود اللہ کا قیام
حکومت مؤقتہ ہند
روسی ہندوستانی مشن
روسی ہندوستانی مشن کا مسلمان ممبر
مرزا محمد علی کے لئے سفر خرچ
حکومت مؤقتہ ہند میں ہماری شمولیت

جنود اللہ کا قیام

جب ہم سردار نائب السلطنت سے مل چکے تھے۔ تو وہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہو کر کابل اس ارادہ سے پہنچے تھے۔ کہ ترکی جا کر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دیئے گئے تھے۔ انہیں پولیس کی حراست سے آزاد کر دیا گیا۔ اور ان کے رہنے کے لئے وہی گھر تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں۔ اور کابل میں ہمارے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو۔ اسی قدر کام میں مصروف رہیں۔ وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منتظم شکل میں سفر کر رہے تھے۔ مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاوری بھی شامل ہو گئے۔ اور ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بیکاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر

مختلف ہو رہے تھے ہمیں جب یہ حقیقت معلوم ہوئی۔ تو میں نے پہلے اُن کے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ اور ایک نوجوان عبدالباری ایم اے جماعت کا صدر منتخب ہوا۔ ہمارا تعلق اس جماعت سے اس رئیس کے توسط سے تھا۔ چونکہ ہندوستانیوں کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی اور وہ لوگ افغانستان کے محکمہ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ہم افغانستان میں دلچسپ کام بھی جاری نہیں کر سکتے تھے لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ اُن کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ انہیں ہم نے علیحدہ کر لیا۔ اور کسی قدر مذہبی اور سیاسی عام اصول پر اُن سے مذاکرات ہونے لگے۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اس عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہنچ گئے جن میں سے مولانا منصور انصاری جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور مولانا سیف الرحمان دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے۔ انہوں نے مولانا رشید احمد صاحب (گنگوہی) سے حدیث پڑھی اور زیادہ عرصہ تک ٹونک میں پڑھاتے رہے۔ آخر میں دہلی کے مدرسہ فتحپوری کے مدرس اوّل تھے۔ جب حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کے مشورے سے انہوں نے یاغستان کی طرف ہجرت کی۔ اور حاجی ترنگ زئی کی معیت میں کچھ عرصہ جہاد میں شریک رہے۔ اور پھر کابل تشریف لائے۔ سرحد میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں حضرت سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ کابل میں سفارت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب دہلوی کے ماتحت ہند میں داعی بنا کر بھیجے گئے۔ حیدر آباد۔ بنگال میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد سنہ ۱۲۴۸ھ میں انہوں نے اپنی مستقل جماعت قائم کر لی سنہ ۱۲۷ھ میں حجاز یمن۔ نجد کا سفر کیا۔ سنہ ۱۲۶۲ھ میں مشرقی افغانستان میں تشریف لائے مولانا ولایت علی مرحوم سید صاحب کی شہادت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اُن کے انتظار میں بیٹھنے والی ایک خاص جماعت قائم کر لی۔ اُن کے بھائی مولوی عنایت علی اس خیال کے مخالف تھے۔ اس لئے جماعت میں منتظرین اور مجاہدین دونوں فریق بنتے تھے۔ ان مجاہدین کی امامت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہو گئی) اُن کے وکیل مولانا محمد بشیر جو لاہور کے اہلِ حدیث جماعت کے معزز کارکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں رہتے تھے۔ نوجوانوں کی ہجرت میں اِس کا خاص کام تھا۔ وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لئے کابل پہنچے ان لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی۔ جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں اگر عسکریت تھی تو اسی قدر جتنی سالوَیشن آرمی

ہیں موجود ہے۔ اِس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کر سکے۔ اور انہیں مغرور طالب علموں کے مکروہ نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے۔ سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اُن کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے جب اُن کے وکلاء کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔

حکومتِ مؤقتہ ہند

ہندوستانی مشن کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ملک کو جنگ میں دھکیلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور انگریزوں سے انہیں بہت کچھ مراعات کی توقع تھی۔ اس کے مقابل فریقِ ثانی کوئی تسلی بخش پروگرام نہ بنا سکا۔ اور ممبروں کا اختلاف سونے پر سہاگے کا کام دے گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پورے نہ ملتے تھے۔ اس لئے بھی ہمیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقع مل گیا۔ حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچا دیئے جس سے اُن کے خواب کو مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشن کی جو گفتگو اعلیحضرت سے ہوتی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وائسرائے کو بھیج دی جاتی۔ اس کے معاوضہ میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیحضرت کیلئے

بھیجا۔ اور اُن کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہو گیا۔ البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں۔ اور اُن سے افغانستان گورنمنٹ اپنی ترقی کے لئے راستے سوچتی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک کام حکومت مؤقتہ ہند کا قیام تھا۔

روسی ہندوستانی مشن

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت مؤقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اسے منظور کر لیا۔ اس پروگرام پر کام کرنے کے لئے اُن کے پاس کوئی ہندوستانی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان اُن کے ساتھ کام کریں۔ مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے ہم سے براہِ راست باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغان افسر بھی موجود رہتا تھا۔ اور ہمارے تبادلہ خیالات سے وہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے لگا۔ جو پہلے سے اس کی توجہ جذب نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے علاوہ دو سکھ بھی تھے جو غدر پارٹی کے ممبر تھے۔ اور ہندوستان سے بھاگ کر بلا پاسپورٹ افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ بھی پہلے پولیس کی حفاظت میں تھے۔ پھر آزاد ہو کر ہمارے پاس رہنے لگے تھے۔ راجہ صاحب کی تجویز یہ تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن میں بھیجا جائے۔

مولانا برکت اللہ مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر اس داخلی مسئلہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ موافق ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ایک فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا لیکن ہم ڈاکٹر متھرا سنگھ کی عام سیاسی واقفیت سے آشنا ہو چکے تھے۔ اس میں ترمیم پیش کر دی۔ کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے پسند نہیں کیا۔ اور اس پر مباحثہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے۔ اور کام کرنے والی طاقت خالص غیر مسلم رہے بلکہ عملی کاموں میں مسلمانوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ ترک۔ جرمن۔ افغان بھی اس میں شریک ہوئے۔ طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس قسم کی ضرورت پیش نہ آئی۔

روسی ہندوستانی مشن کا مسلمان ممبر

ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لئے ایک ممبر مانگا۔ اس نے اپنی جماعت کے پورے مشوروں کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا۔ یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ مذہبی جذبات جیسے نوجوان میں ہوتے ہیں۔ اس میں کسی سے کم نہیں۔ سمجھدار ہے ہنس مکھ ہے۔ نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا لیڈر رہے۔ اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا۔ شیخ محمد ابراہیم جب کابل چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق بنایا۔ (قرار دیا) میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جا سکتی ہے۔ اس میں مرزا محمد علی کی محنت و ہمت کا حصہ غالب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا۔ تو شاید کوئی بڑا کام نہ کر سکتا۔ خدا نے صحیح اشتراک میں قوت رکھی ہے۔ اجزاء کے انفرادی قوت میں اضعافاً مضاعفہ قوت نازل ہوتی ہے دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ تو آپس میں کارکن شریک ہو جائیں عقلی اصولِ صحیحہ پر شرکت ہو عمل اور تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے۔ فقط اتنی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر ایمان کا دعوے رکھتی ہے۔ کیا اِن میں سے ایک مختصر جماعت سمجھدار پیدا نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ہو سکتی ہے۔ مگر ان کو قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں۔ مخالفین کے پروپگینڈے سے مرعوبیت نے انہیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔ کابل سے سفر کرنے سے چند دن پہلے مرزا محمد علی روس کی انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے بعد ہمارا اِن کا رسمی

اشتراک باقی نہیں رہا۔ فقط دوستی اور محبت ہے۔

مرزا محمد علی کیلئے سفر خرچ

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ دے دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دیں گے۔ یا شاید حکومتِ افغانیہ انتظام کر دے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہماری ساری زندگی اسی طرح گذری۔ کہ روپیہ پیسہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل گیا۔ اس طرح سے ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ اعتماد پیدا ہوتا۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتے رہے۔ کابل کا سفر بھی اسی قاعدہ پر تھا۔ جب ہم قندھار پہنچے تو ہمارے پاس فقط ایک پونڈ تھا۔ اور ہم چار آدمی تھے۔ نائب الحکومت نے ہمیں سفر خرچ دے دیا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ یہ خالی ہاتھ ہیں۔ جب ہم کابل پہنچے تو ایک مہینہ میں ہمارا خرچ ختم ہو گیا۔ اور ہم نے جس قدر کپڑے یا سامانِ راحت خریدا تھا۔ سب بیچ ڈالا۔ اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کسی قدر روپے بھیجے اور لوگوں سے ملنے کے قابل ہم کپڑے بنا سکے۔ پھر سردار نائب السلطنت نے بطور مہمانی شاید پانچ سو روپے بھیجے تو ہمارے بعض ساتھی جو ہندوستان سے واپس ہوئے۔ ان کی ضروریات میں صرف ہو گیا۔ میں شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ کھانے میں شروع سے شریک ہو گیا تھا۔ مگر اور قسم کی اعانت ہم اُن سے نہیں چاہتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ہند سے کام کے لئے بہت سا روپیہ لایا ہوں۔ اور میں اسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب مرزا محمد علی کا خرچ دینا ضروری تھا۔ میں نے شیخ محمد ابراہیم سے روپیہ مانگا۔ مگر اس مرحوم نے اس وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام صرف ہوا۔ اپنے فیصلے سے انہوں نے یہ سب کام کیا۔ لیکن اسی خاص وقت پر اُن سے غلطی ہو گئی۔ اُن کے دوسرے ساتھی مولوی محمد علی قصوری تھے۔ مولوی عبدالقادر[1] قصوری سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابوالکلام نے کر دیا تھا۔ مگر وہ شیخ محمد ابراہیم کی طرح ہمارے کام میں شریک نہیں تھے خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم پر ہمارا اعتماد تھا۔ عام معاملات میں مولوی محمد علی بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنی تکلیف کا ہلکے الفاظ میں اُن سے ذکر کیا۔ وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے جلد اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دیں۔ اللہ تعالےٰ کا خاص لطف دیکھا۔ اور مولوی محمد علی کے از حد ممنون ہوئے۔ جیسے آخر میں شیخ محمد ابراہیم کا تمام اندوختہ ہمارے کام میں صرف ہوا۔ اسی طرح مولوی محمد علی نے جس قدر کابل میں کمایا تھا۔ وہ سب ہمارے ہندوستانی کاموں میں صرف ہوا۔ جزاھم اللہ خیراً۔ سیاسی کام فقط نظریات یا عملی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس میں کامیابی کے لئے ایک مستعد جماعت

---

[1] والد مولوی محمد علی

اور روپیہ کی بھی ویسے ہی ضرورت ہے جیسے علم و عمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالےٰ کا شکر کریں۔ وہ تھوڑا سمجھا جائے گا۔ کہ اُن کے نام سے کابل میں بے سرو سامانی سے کام شروع ہوتا ہے۔ تو اُن کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوتے ہیں۔ اور روپیہ تو مولوی محمد علی اور شیخ محمد ابراہیم کا تھا۔ جو وقت پر کام آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اُن لوگوں کا نام قوم کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے۔ اور ہمیشہ کے لئے ان کو دعا کرنی چاہیئے۔

حکومتِ مؤقتہ ہند میں ہماری شمولیت

اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی۔ اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں۔ ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومتِ مؤقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ انہیں خیال تھا کہ شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں۔ کیونکہ اس کا جس قدر نظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا۔ اُس میں راجہ صاحب کے نام میں وفاداری کا حلف ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا۔ جسے انہوں نے منظور کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتداء میں حکومتِ مؤقتہ کے

تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں جنگِ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال اُن کے دماغ پر غالب تھا۔ یورپین لوگوں سے وہ ان کی زبان میں باتیں کر لیتے۔ اور ڈیموکریسی (DEMO CRACY) کے لیکچر دے ڈالتے لیکن ہندوستانی معاملات میں اُن کی موروثی خصلت نمایاں رہتی ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انہیں راضی کیا۔ کہ حکومتِ مؤقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے گی۔ جسے انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کے لئے معین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریذیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور وہ لائف پریذیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔ جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومتِ مؤقتہ کے لئے تین مرکز تجویز ہوئے۔ کابل، نیپال، بنگال شمالِ شرقی۔ کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومتِ موقتہ مرکزِ کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں صاحب جب برسرِ اقتدار ہوئے تو انہوں نے ہمیں حکومتِ مؤقتہ ہند کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں

مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دورانِ جنگ میں بعض اہم اُمور میرے حوالے کئے گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانہ میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حروفوں سے لکھے جائینگے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جب جنگ ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے۔ تو امیر امان اللہ خاں نے اُن کے اعزاز میں ایسے کام کئے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرفاً بہ حرفاً قبول فرمائے۔ آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے۔ امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومتِ مؤقتہ کا کام کرنے سے روک دیا۔ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ جب وہ وعدہ کرنے میں تعلّل نظر آیا۔ تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بذاتِ خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا۔ مگر میرے نوجوان رفقائ (جنکی مشقتیں ہماری عزت افزائی کی سبب بنیں) کا مستقبل برباد ہو جاتا۔ اس لئے میں کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان کے مجتمع نہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کا نقصان کر دیا۔ اگر کبھی کوئی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر یکجا ہو جائینگے ÷ واللہ الموفق والمعین۔

باب چہارم

ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی روسی مشن پر بھیج دیئے گئے۔ اور ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کئے گئے۔ محمد علی کا خادم افغان تھا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ مشن ترمذ سے تاشقند پہنچا۔ گورنر نے زار کو مطلع کیا۔ وہ اس وقت۔ پریشان تھا۔ اُس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دیئے۔ اور اس مشن کی کارروائی بہانا بنایا۔ برطانیہ مشن کو جعلی قرار دیتا ہے لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور افغانی حملہ سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ برطانیہ ہندوستان سے ممبروں کی تشخیص کراتا ہے۔ مگر صحیح طور معتین نہ ہو سکے۔ بالآخر زار نے ممبروں کے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔ یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا۔ روسی و انگریزی اتحاد میں کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا جس کی تلافی کے لئے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔

ہندوستانی حکومت کا
ایک اخلاقی حملہ
استنبول مشن اور جاپانی مشن
ممبروں کی گرفتاری
ہندوستانی مشن
ہماری نظر بندی اور قید
انور پاشا کا خط

روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام ہے۔ سونے کی پٹی (جو سونے کی پٹی پر کندہ کرایا گیا تھا) ایک خط گورنر تاشقند کے نام تھا۔ اس میں اس مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے۔ جب یہ مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ سردار کے تمام سوالوں کے جواب میں یہی کہتا رہا۔ کہ بخیر رفتیم و بخیر آمدیم۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے مرزا محمد علی کو بلایا۔ اور سفر کی کیفیت پوچھی۔ محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ جیب سے اپنی کتاب نکالی اور مفصل حالات سے گفت و شنید کا خلاصہ سب ذکر کر دیا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہا۔ کہ اگر ہم مولانا عبید اللہ کی بات نہ مانتے۔ تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

ہندوستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ

ہماری تربیت ہندوستانی تعلیمات میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوئی ہے۔ دیوبند جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے۔ لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسمٰعیل شہید کے طریقہ پر ہے۔ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے۔ کہ مولانا اسمٰعیل کے اصلی اتباع یہ لوگ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے۔ میرے بزرگ سب اسی دیوبندی مسلک سے ملتے جلتے ہیں۔ اگرچہ علماء دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے۔ ہندوستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا۔ ان کے قندھاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے۔ اور سردار نائب السلطنت سے ملے اور اُنہیں یقین دلایا۔ کہ مولانا عبید اللہ حکومت ہند کا فرستادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانستان حکومت کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے۔ سردار نائب السلطنت کے سکرٹری نے ہم سے ذکر کیا۔ ہم نے اُس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی۔ آئی۔ ڈی کے افسروں کو مقرر کر کے حکومت کی رائے معلوم کریں۔ اس پر جس قدر سزا ہو اس سے دریغ نہ کریں اگر ذرا سا شبہ ثابت ہوا تو مجھے توپ سے اُڑایا جائے۔ دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ رہا ہوں وہیں سے شروع کروں گا۔ گویا یہ زمانہ بیماری کی رخصت میں حساب ہو گا۔ غالباً یہ تجویز سردار کو پسند آئی۔ اور اس پر عمل کیا گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان خفیہ نویسوں نے کہا۔ کہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ایک نقطہ بھی سفید نہیں رہا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے ہمیں خاص طور پر باریاب فرمایا۔ اور ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

استنبول مشن اور جاپانی مشن (پہلے مشن کی کامیابی میں راجہ صاحب نے

ے دیکھو مقدمہ میں کمیشن کی رپورٹ کا اقتباس ؛

دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہمارے منشاء کے مطابق استنبول بھیجا گیا اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی۔ اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے۔ یہ ایران کے راستے استنبول جائے گا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی۔ اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے سے جاپان جائیں گے کیپٹن ہنڈیٹس سب سے پہلے کابل سے واپس گئے۔ امیر صاحب نے رخصت کا فرمان دے دیا۔ وہ جانے کے وقت تین سو پونڈ میرے نام چھوڑ گئے۔ راجہ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ وصول کر لوں۔ اس میں سے ایک سو پونڈ تو راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ نے اپنے کپڑے تیار کرنے کے لئے لے لئے۔ اور دو سو پونڈ شیخ محمد ابراہیم کے پاس امانت رکھ لئے۔ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی اور میر الجتیباع بیز احمد حسین گھر میں رہتے تھے۔ اس پر رات کو ڈاکہ پڑا۔ اور وہ تمام روپیہ اور دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکہ کو ہمارے روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے جب استنبول مشن جانے کا وقت آیا۔ تو اس کے لئے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دیئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض کا تو فقط نام تھا۔ اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے ادا کر دیا۔ دوسرے مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکہ کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اور چوروں

کے پاس روپیہ کا ثبوت ہو چکا تھا اگرچہ ہمیں اس سے کچھ بھی نہیں ملا۔ اب راجہ صاحب کے کہنے سے میں مولانا برکت اللہ کے ساتھ سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس واقعہ میں روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا۔ ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی۔ سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ ساتھ لائے۔ اس طرح سے دوسرا مشن بھی روانہ ہو گیا

ممبروں کی گرفتاری

روس نے دوسرے مشن کو جب اُن کی سرحد عبور کر چکا۔ تو گرفتار کیا۔ اور انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کیا۔ چار ممبر لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھا۔ اسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور باقی تین ممبر نظر بند کر دیئے گئے۔ اُن میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقع پر ہمارے ساتھ اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا۔ سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا۔ اسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا۔ اس نے تمام واقعات حکومتِ مؤقتہ کے اور جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیئے۔ اور باقی دو ممبروں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر اسے چھوڑ دیا گیا۔ حکومت ہند روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کے لئے پریشان تھی۔ اب اسے باطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

نتیجہ۔ حکومت ہند کے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ شیخ محمد ابراہیم اور

مولوی محمد علی حبیبیہ سکول سے معزول کر دیئے گئے۔ اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ سکول کا طالب علم تھا۔ خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد کے ہم جماعت قونصل اور نائب وزیر اور جرنیل اور ممبر بن گئے ۔ اور یہ باوجودیکہ علمی اور عملی لیاقت میں اِن سے کسی طرح کم نہیں۔ اسی طرح جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔ اِسی طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں مجاہدین میں رہے۔ پھر شیخ محمد ابراہیم حاجی ترنگزئی کے پاس چلے گئے۔ اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی۔ راستہ میں افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہو گئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے اُن کے ساتھ تھے۔ اُس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ اس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے۔ کہ شیخ صاحب سمجھاتا چاہتے ہیں۔ کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو۔ بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری کچھ عرصہ تک مجاہدین میں رہے اور پھر کسی طرح سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر پہنچ گئے۔ اُس کے بیانات سے بھی ہندوستانی گورنمنٹ کے علم میں کچھ اضافہ ہوا۔

ہندوستانی مشن

جب یہ دونوں حضرات یاغستان جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک ہندوستانی مشن بھی بھیجا گیا۔ ہم جب کابل پہنچے تو اپنے دو ساتھی واپس بھیجے تھے۔ اُن کے پاس بعض کاغذات اور پیام تھے انہوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام کیا۔ اب راجہ مہندر پرتاپ چاہتے تھے۔ کہ اُن کی اطلاع اُن کے بھائیوں کو ملے اور وہاں سے خیریت کی خبر آئے۔ اِس کے لیے ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو مامور کیا۔ وہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ یاغستان گیا۔ اور وہاں سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر خط پہنچا دیا۔ جواب لے کر دو مہینہ میں بخیریت پہنچ گیا۔ مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے۔ اُن کا خط انہیں مزار شریف میں پہنچا دیا گیا۔ اور راجہ صاحب اِس سے بہت مسرور و ممنون ہوئے۔ اِس کے بعد راجہ صاحب ہم سے بھائیوں سا معاملہ کرتے رہے۔ اپنے پرائیویٹ اُمور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے رہے۔ اور بسا اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے) اس مشن کا ایک حصّہ وہ کاغذات تھے۔ جو میں اور مولانا منصور نے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں بطور رپورٹ لکھے تھے۔ ہم نے انہیں نوجوانوں میں سے ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا۔ اسے کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دیئے کہ وہ شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کو پہنچا دے۔ اور شیخ صاحب حج پر جائیں۔ اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کریں۔ اِس اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دیئے۔ خانصاحب نے سر مائیکل اڈوائیر کو

پہنچائے۔ اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں۔ ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز کے بعد حضرت شیخ الہند اور اُن کے رفقاء مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصہ کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لئے موت سے زیادہ ناگوار تھے۔ مگر ایک بات کی مسرت بھول نہیں سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لئے ناقابل برداشت مصیبت ہوتی۔ اب ہم خوش ہوتے ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہو گیا۔ ہمارے لوگ قید و مصیبت میں ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن کے لئے آسانی کردے گا۔

ہماری نظربندی اور قید اس کے بعد ہندوستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا۔ کہ مولٰنا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمان کابل سے یاغستان روانہ کردیئے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمان کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا۔ اور ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ کرالیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کا مہمان ہو کر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی آخری حکومت تک وہ مستوفی کے ساتھ رہے۔ اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا۔ اس میں اس کی امداد کرتے۔

انور پاشا کا خط۔ ہندوستانی حکومت کو اطلاع ملی۔ کہ حضرت مولانا

شیخ الہند نے ایک خط انور پاشا سے لیکر ہندوستان بھیجا ہے۔ اور وہ اکابرِ دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے۔ اس لئے ہندوستان میں جس قدر کوشش ہوئی۔ اُس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب جب امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت سے امداد لی گئی تو مستوفی الممالک نے دیوبند کے ایک پرانے طالب علم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا۔ افغانستان میں سے ڈھونڈھ نکالا۔ اُسے دیوبند بھیجا گیا کہ اعلیحضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں۔ اس میں اگر مولانا سیف الرحمان کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی۔ تو یہ تجویز بروئے کار ہی نہ آسکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتہ بھی مولانا سیف الرحمان سے دریافت کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بزرگ کو کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ اس لئے خط ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد احتیاط پسند لوگوں نے وہ خط جلا دیا۔ مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے اور ایک زمانہ تک وہیں رہے۔ اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لاکر قید کر دیا گیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے۔ اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لئے موزون نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے متعلق رکھی تھی۔ انہیں ہم نے توجہ دلائی۔ اُس نے ہمارے لئے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوائے۔ اور عید رمضان پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی ممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمان کی امداد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔

ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوال کی حفاظت میں رہے۔ ہمارا ایک رفیق اس محبس سے بھاگ گیا۔ اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچا۔ اس کا نام رحمت علی ذکریا ہے۔ اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلا دی تھی۔ اس کو ہم منع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا نام الزام ہم پر عائد کیا جائے گا۔ اس لئے ہم نے مولانا سیف الرحمان کے توسط سے اُن لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلی مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے۔ ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کردیا گیا۔ اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقبل بادشاہ بن گیا

باب پنجم

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ ہوئے۔ تو سردار نائب السلطنت ولی عہد قرار پائے۔ دونوں بھائیوں کے اتفاق سے سلطنت کا کام چلتا رہا۔ جب امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے جوان ہوئے تو اس کی طبعی خواہش تھی کہ سردار عنایت اللہ معین السلطنت ولی عہد بنا دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے نہایت دانائی سے کام لیا۔ حرب عمومی کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے اولاً اور تمام ہندوستانیوں، ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے ثانیاً امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا۔ کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ تو امیر نے تمام اینٹی برٹش معاملات سردار نائب السلطنت کے سپرد کیے۔ اور آپ پرو برٹش معاملات کو نمٹاتا رہا۔ انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا۔ کہ یاغستان میں تقسیم کرے۔ اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت نامہ

حاصل کرے۔ اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا۔ کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت تم بے شک جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے۔ اس لئے عام بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اسی طرح حاجی ترنگزئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا۔ بلکہ حاجی ترنگزئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے۔ کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں۔ یہ انگریزی روپیہ انہیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اسکے سرانجام دینے والے نائب السلطنت تھے۔ تمام بیعت نامے انکے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔ امیر صاحب نے اس ترکی جرمن۔ ہندی وفد کو یہ جواب دیا۔ کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہنچ جائیں اس وقت روس اور انگریز دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ خلاف مصلحت ہے البتہ جس وقت ترکی جرمن فوج کا پیش خیمہ افغانستان پہنچ گیا۔ اسی دن اعلانِ حرب کیا جاوے گا۔ دوسری طرف روسیوں اور انگریزوں نے تمام رستے روک لئے تھے۔ اور انگریزی فوج کا عراق پر حملہ محض اس پیش قدمی کے روک لینے کے لئے تھا۔ اس دوران میں یہ بھی کہا جاتا کہ اگر روس کا خطرہ دفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں۔ اس خطرہ کو معلوم کرلے کے لئے ہندی روسی وفد[1] تجویز ہوا۔ جب روس کی قوت کمزور ہو گئی۔ اور اس مشن کی معلومات سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا۔ تو نائب السلطنت کو جو لوگ ملتے تھے۔ انہوں نے جہاد وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اعلیٰحضرت سے ذکر کیا۔ امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور قومی بزرگ شریک تھے۔ امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی۔ تو سوائے سردار معین السلطنت کے سب نے متفقاً یہ قرار دیا۔ کہ لڑنا ضروری ہے۔ اہل شوریٰ کو اس نقطہ پر جمع کرنا سردار نائب السلطنت کی قوت کا مظاہرہ تھا۔ امیر صاحب حیران ہو گئے۔ اور اپنے شاہانہ فیصلہ سے اس کو رد کر دیا ایک معین السلطنت کیونکر امیر کا ہم خیال رہا۔ اس کی حقیقت یوں ظاہر ہوئی۔ کہ انگریزوں نے اس کو اسی شرط پر ولی عہد قبول کر لیا ہے۔ یہ عجیب بات دنیا سنے گی۔ کہ حضرت صاحب چہار باغ کو جو معین السلطنت کے مرشد تھے۔ انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت کے لئے بلایا۔ اور معین السلطنت کو اپنی قومی اور مذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور یوں خواب سنائے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے۔ کہ میں اس کام کو پورا کردوں۔ اس کے بعد اعلیٰحضرت اور سردار نائب السلطنت کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ اور افغانوں میں انقلابی آثار ظاہر ہونے لگے۔ سردار نائب السلطنت کو یقین ہو گیا۔ کہ اس کی تمام کارروائی سے مطلب میری ولایت کے فیصلہ کو انگریزوں کی تائید سے منسوخ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے انتظامی مشن کو ذرا ڈھیلا کر دیا۔ اور سازشیں شروع ہونے لگیں۔ امیر حبیب اللہ عام بادشاہوں کی طرح اخلاقی عیوب سے پاک نہیں تھے۔ اب یہ مرض بہت ترقی کر گیا اور شرفاء کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ دراز کرنے لگے۔ اس میں بعض عفیف عورتوں نے

---

[1] یعنی ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی کا وفد۔

عصمت دری کے بعد خودکشی کر لی۔ سردار معین الدولہ امیر امان اللہ خاں تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی والدہ علیا حضرت سے مخاطب تھیں معین السلطنت کا مخالفین سے ملنا اُن کا طبعی تھا جشن کی سیر میں رات کو امیر صاحب پر بالاخانہ سے گولیاں برسائی گئیں مگر امیر صاحب بچ گئے۔ ابھی حرب عمومی ختم نہیں ہوئی تھی مستوفی الممالک نے اُس کا الزام سردار معین الدولہ اور اس کے رفیقوں پر لگایا۔ اس سے سردار نائب السلطنت اور سردار معین الدولہ میں نفاق ہو گیا۔ اُن کے ساتھ محمود خاں طرزی اور سردار سپہ سالار بھی مل گئے۔ اب یہ جماعت بہت قوی ہو گئی یہ دونوں سردار معین الدولہ کے طرفدار تھے۔ اور نائب السلطنت کو پسند نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں جس قدر ظلم اور داخلی نظام میں خرابیاں ظاہر ہوئیں۔ اُن کا ذمہ دار براہِ راست سردار نائب السلطنت تھا۔ اس طرح جس کا لوگ تجربہ کر چکے ہوں اس کو دوبارہ بادشاہ نہیں دیکھتے معین السلطنت ایک سادہ مزاج تھا۔ ایسے سیاسی انقلاب میں اُس پر اعتماد نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس وقت تو وہ علانیہ باپ کا طرفدار تھا سردار امان اللہ خاں کی شرکت سے انقلاب کی تکمیل میں بہت آسانی ہو گئی۔ علیا حضرت صاحبہ امیر صاحب کی خانگی زندگی پر حاوی تھی۔ امیر صاحب کو ان کے واسطہ سے پیغام پہنچایا گیا۔ کہ اگر وہ اپنی بداخلاقی سے باز نہ آئے تو اُن کی خیر نہیں مگر اس کا اس کے مزاج پر اُلٹا اثر ہوا۔ اس طرح یہ ڈراما سوچا گیا کہ امیر صاحب کو قتل کر دیا جائے۔ تو وہاں نائب السلطنت کو امیر مان ہیں۔ تاکہ معین السلطنت کا حق زائل ہو جائے۔ اور پھر نائب السلطنت کے مقابلہ میں امیر امان اللہ خاں آ جائے۔ اور ان کو ختم کر دیا جائے۔ کئی موقعوں پر ذرا سی فروگذاشت کی وجہ سے تمام کام بگڑتا بگڑتا رہ گیا لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ اس لئے یہ سارا معاملہ بخیر و خوبی اسی طرح انجام پذیر ہوا جس طرح سوچا گیا تھا۔ اعلیحضرت امیر امان اللہ خاں نے پہلے دن استقلال کا دعوے کیا۔ اور ہم قید و بند سے آزاد ہو گئے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا تعارف

ہم نے بعض اشد ضرورتوں کی وجہ سے ڈاکٹر میر عزت بیگ سے ایک ہزار روپیہ ایک سال کے وعدہ پر قرض لئے تھے۔ جب یہ مدت پوری ہونے کو ہوئی۔ تو ہم مستوفی کے پاس نظر بند تھے۔ روپیہ کہیں سے لے کر ادا نہیں کر سکتے۔ اور اس عدم ادائیگی کا اثر ہمارے مستقبل پر بہت برا ہوگا۔ اسے ہم خوب سمجھتے تھے۔ ہم نے مجبوراً سردار معین الدولہ کی خدمت میں اپنی ضروریات مفصل لکھ کر عرض کیا۔ کہ مکمل بارہ سو روپیہ ایک سال کے لئے ضروری دلوایا جائے۔ یہ دو سو روپیہ زائد ہم نے آغا سید علی بخاری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھے تھے۔ ایک عرصہ سے وہ بھی پشاور سے ہجرت کر آئے تھے۔ اور امیر صاحب نے اُنہیں ہم سے علیحدہ نظر بند کر دیا تھا جس وقت سید الاحرار مولانا محمد علی مغفور ہمیں رخصت کرنے کے لئے دہلی میں ملے آغا صاحب مرحوم اُن کے پاس تھے۔ الغرض سردار معین الدولہ نے روپیہ شام کو مخفی مستوفی کے گھر پہنچا دیئے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ سردار نے ہم کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اور مستقبل کے متعلق اشارہ کنایہ سے باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ملاقات بھی ہمارے خاص کاموں میں سے تھی

خدا کے فضل سے اس میں کامیاب رہے تھے۔ ہمارے متعلق مفصل معلومات سردار معین الدولہ کو سرداران محمود طرزی اور سپہ سالار سے ملتی رہتی تھیں۔ شروع میں ہم شیخ ابراہیم سے ملے تو اس نے ہمیں دولت افغانیہ کے تمام ارکین کے متعلق مفصل اطلاعات دیں۔ جب سردار نائب السلطنت اور سردار معین السلطنت کے معاملات تبلا چکے تو آخر میں کہتے ہیں کہ پس پردہ ایک اور قوت ہے جو نہایت سنجیدگی سے باقاعدہ بڑھ رہی ہے۔ اور وہ سردار معین الدولہ ہے۔ اس کے بعد اول ہماری ملاقات اُن سے نہ ہو سکی۔ مگر جب کبھی ہم اُن سے ملے تو اس طرح۔ جیسے بادشاہ ہونہار لے شہزادے سے ملتا ہے۔ جب امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں قتل ہوئے۔ اس وقت ہم مستوفی کے گھر نظر بند تھے۔ اور مولانا سیف الرحمان کی زیر نگرانی رہتے تھے۔ مولانا سیف الرحمان کے کاموں سے متجاہل بنکر اُن سے معاملہ کرتے رہے۔ اس میں ہمیں بعض سخت تکلیفیں پہنچیں۔ مولانا نہیں چاہتے کہ ہمیں واقعات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں۔ مگر خدا کی قدرت اُڑتی چڑیا ہمارے کانوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔ بعض حصہ ہم فوراً سمجھ لیتے بعض اوقات واقعہ گزرنے پر حقیقت منکشف ہو جاتی۔ جب جلال آباد پہنچے تو ایک ہفتہ تک ہم پریشان اور دیہات میں پھرتے رہے۔ جب اعلیٰحضرت امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل ہو گئے تو انہوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو مسکرا کر فرمائے "من ہمو ہستم" اس خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔

باب ششم

اعلیحضرت امیر امان اللہ خاں کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا سی جھلک بھی دیکھ لی جس قدر وہ اپنی وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اسی کے قریب قریب تھا۔ ہم انکی پرائیویٹ مجلسوں میں شامل ہوتے تھے جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ ہم سے اُن کا برتاؤ اسی طرح کا ہوتا۔ ہم نے کوئی مشورہ عرض نہیں کیا۔ جو قبول نہ فرمایا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم نے سلطنت افغانستان کے مستقل و مستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ اس لئے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔ حضرت مولانا شیخ الہند کی وفات پر جس شانِ بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی منعقد کی۔ وہ ایک یادگار ہے۔ میں اس تقریر کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں "مولانا محمود الحسن یک کار را شروع کردند من او را پورا میکنم"۔ راجہ مہندر پرتاپ جب یورپ سے واپس آئے اور اعلیحضرت سے خاص ملاقاتیں کر چکے تو اعلیحضرت کو

آبیڈیل کنگ لکھا کرتے تھے ۔ ہم نے آخر میں اعلیحضرت سے ہندوستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی تھی۔ برٹش وزیر نے افغان وزیر خارجہ کو راضی کر دیا۔ کہ ہمیں ہندوستانی یونیورسٹی کے لئے موقع نہیں دیا جائیگا لیکن اس کی قیمت اُسے کافی مقدار میں ادا کرنی پڑی ۔ اگر ہمارے رفقا نوجوانوں کا مستقبل ہمارے سامنے نہ ہوتا۔ اور حکومتِ مؤقتہ کی بعض کامرانیوں میں ہمیں ضروری شکست نہ ہوتی۔ تو ہم اعلیحضرت کی سلطنت سے شاید باہر جانے پر راضی نہ ہوتے ۔ جب سے کابل میں ہم نے شیخ محمد ابراہیم کی جگہ پر مرزا محمد علی عرف احمد حسن کو اپنا شریکِ عمل بنایا۔ اُسی وقت احمد حسن کا مددگار ظفر حسن تجویز کر لیا تھا جب احمد حسن یا محمد علی اشتراکی جماعت میں شامل ہو گیا تو ہمارا معتمد اس زمانہ میں ظفر حسن رہا۔ افغانی، انگریزی محاربہ میں ظفر حسن سردار سپہ سالار کے ساتھ ٹل کے محاذ پر تھا۔ وہاں اُس کے کارنامے بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے ۔ اور سلطنتِ افغانیہ اسے برائے نام خدمت کرنے پر معقول تنخواہ دیتی رہی جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گزارہ کرتے رہے ۔ ظفر حسن کے مددگار اللہ نواز خاں مقرر ہوئے ۔ جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفر حسن کے ہم جماعت تھے ۔ افغانی انگریزی محاربہ میں وہ ہندوستان بھی آئے ۔ کابل سے رخصت ہونے پر ہم نے اپنی تمام دستاویزات اُن کی تحویل میں رکھ دیئے تھے ۔ کہتے ہیں کہ سقاو کے فتنہ میں وہ تمام کاغذات کھوئے گئے ہمیں بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ کاغذات برٹش حکومت کے ہاتھ آ گئے ہیں ۔ اللہ نواز نے سقاو کے مقابلہ میں خوب کام کیا۔ اس لئے افغانستان کی موجودہ حکومت میں وہ ایک معزز کارکن مانے جاتے ہیں ۔ مہاجرین کی کثیر تعداد میں ہمارے بعض عزیز بھی ہم سے ملے ۔ مولوی احمد علی کو ہم نے ہندوستان واپس بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ مدت سے ہم اسے اس پر راضی کر سکے ۔ ڈاکٹر نور محمد سندھی حیدرآباد

سے پہنچ گئے تھے ۔ وہ ہمارے ساتھ رہے ۔ حکومتِ مؤقتہ کا کام جب اعلیحضرت نے روک دیا۔ تو ہم نے کابل کانگریس کمیٹی بنائی جس کا روحِ رواں ڈاکٹر نور محمد تھا۔ اس کا الحاق گیا کانگریس میں منظور ہو گیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہمارے کانگریس کمیٹی کا افسر تھا۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے نوجوان ممبر اسے جانتے تھے ۔ ہمارے مکرم ڈاکٹر انصاری کانگریس کے سکرٹری تھے ۔ اس لئے یہ الحاق کا مسئلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ ہماری یہ کانگریس کمیٹی سب سے پہلی وہ کمیٹی ہے ۔ جو برٹش ایمپائر سے باہر قائم ہوئی تھی ۔ تیسرے نوجوان جن کا ذکر اہم ضروری سمجھتے ہیں ۔ وہ شیخ محمد اقبال شیدائی ہیں ۔ میرا مولد سیالکوٹ ہے اور شیدائی بھی سیالکوٹی ہیں ۔ ہم وطن کی محبت میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوئے شیدائی صاحب سے ہمارا پرانا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لئے خیالات میں ہم زیادہ متفق نہ ہوئے ہوں ۔ مگر عملاً ہم ایک بن گئے تھے ۔ اور آگے چل کر خیالی افتراق بھی کم ہو گیا میں لکھ چکا ہوں کہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میرا بھتیجا عزیز احمد پہلے پہنچ چکا تھا میرے ساتھ جو تین آدمی آئے تھے ۔ ان میں سے ایک میرا بھتیجا محمد علی ابن حبیب اللہ تھا راجہ صاحب کے گھر پر میں نے محمد علی کو بھیجا تھا۔ اور قندھار کے محاذ پر سردار اعتماد الدولہ کی خدمت میں اسی کو معین کیا تھا سردار اعتماد الدولہ نے اس کی خدمات کے اعتراف میں خاص خلعت سے سرفراز فرمایا تھا۔ میرے یہ دونوں عزیز میری خاص خدمات کے متکفل رہے کھانا، کپڑا، دوا کے متعلق مجھے کسی دوسرے کی امداد کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہماری کابل کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد جیل میں تھے اور ہمارے رفیقوں کو ہم سے علیحدہ کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ ایسے حالات میں آرام سے بیٹھ کر شاہی مہمانی کا لطف اٹھانا ناممکن تھا۔ سوویٹ ایشیا تعلقات کی ابتداء

اعلیحضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت اور مصلحت سے بروئے کار آئی جس میں راجہ مہندر پرتاپ نے کافی حصہ لیا۔ انہیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان آتے جاتے رہے جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا۔ تو اس کے لیڈر جو بندرا ناتھ رائے مقرر ہوئے جو اسے کئی سال تک چلاتے رہے۔ اس لئے ہمارے دوست بن گئے۔ اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریائے جیحوں عبور کر کے ترمذ میں سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے۔ اور دنیا کے انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔

ہم نے اپنے حالات کسی قدر اختصار سے اپنے سیاسی پروگرام کے شروع میں لکھے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے بعض اوقات زندگی عربی دوستوں کی واقفیت کیلئے عربی میں لکھے۔ مگر یہ بات ہمیشہ محسوس ہوتی رہی کہ اگر کسی قدر حالات کابل کا قیام اور وہاں سے رخصت ہونے کے متعلق مستقل تحریر نہ کریں گے۔ تو اس اختصار کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ **الحمد للہ** آج اس سے بھی فارغ ہوئے +

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ وسلم۔ وآخر دعوانا

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ بلدۃ اللہ الحرام حارۃ الباب عبید اللہ سندھی۔

سابق ناظم جمعیۃ الانصار، سابق ناظم نظارۃ المعارف **دھلی** +

ختم شد

محمد عنایت اللہ کاتب

منصور والیہ ضلع لائل پور

احقر

خواجہ محمد عفی عنہ